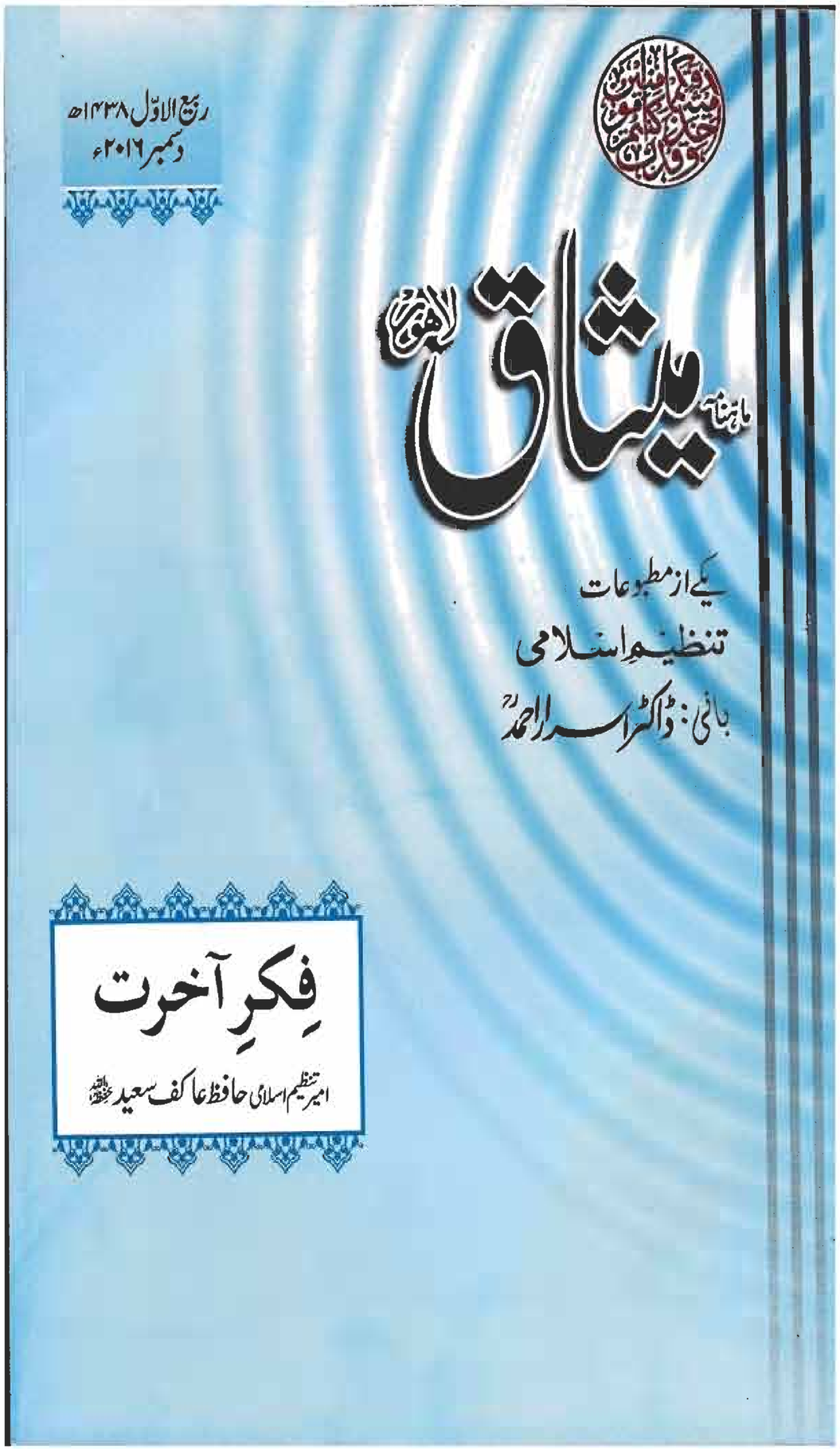

ربیع الاول ۱۴۳۸ھ
دسمبر ۲۰۱۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فِکرِ آخرت

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول: سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن — صفحات:360، قیمت 475 روپے
حصہ دوم: سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ — صفحات 321، قیمت 425 روپے
حصہ سوم: سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ — صفحات 331، قیمت 425 روپے
حصہ چہارم: سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف — صفحات 394، قیمت 485 روپے
حصہ پنجم: سُورۃُ مریم تا سُورۃُ السّجدۃ — صفحات 480، قیمت 575 روپے
حصہ ششم: سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات — صفحات 484، قیمت 590 روپے
حصہ ہفتم: سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس — صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 65

شمارہ : 12

ربیع الاوّل 1438ھ

دسمبر 2016ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

❁ اندرون ملک	300 روپے
❁ بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
❁ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
❁ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ **عرضِ احوال** ——— 5

دنیا میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کا سبب: سرمایہ دارانہ نظام — ادارہ

❁ **بیانُ القُرآن** ——— 9

سورۃ النمل (آیات ۴۵ تا ۹۳) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **تذکیر و موعظت** ——— 27

فکرِ آخرت — حافظ عاکف سعید

❁ **تعمیرِ سیرت و کردار** ——— 47

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور (۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **تذکّر و تدبّر** ——— 65

قرآن کریم کی اُصولی باتیں (۱۵) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

❁ **اُسوۂ حسنہ** ——— 79

سُنّتِ رسول ﷺ کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

❁ **حسنِ معاشرت** ——— 85

جھوٹ: تمام برائیوں کی جڑ — حافظ محمد مشتاق ربانی

❁ **دعوتِ فکر** ——— 90

دہشت گردی کی روک تھام میں عوام کا کردار — پروفیسر محمد احمد خان

❁ ❁ ❁

دنیا میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کا اصل سبب:

سرمایہ دارانہ نظام

امریکہ کے صدارتی انتخابات میں دو لاکھ ووٹ زیادہ حاصل کرنے والی ڈیموکریٹک اُمیدوار ہیلری کلنٹن کو ''ہرا'' کر وائٹ ہاؤس میں قدم رنجہ فرمانے والے ڈونلڈ ٹرمپ نے گویا تاریخ کے دوسو سالہ دھارے کو یکسر پلٹ دیا ہے۔ وہ امریکہ جو کل تک خود کو دنیا میں انسانی حقوق' جمہوریت اور آزادی کا علمبردار اور امن عالم کا سب سے بڑا ٹھیکیدار سمجھ رہا تھا' بنیاد پرستی' انتہا پسندی اور مذہبی و نسلی منافرت کے خلاف دنیا بھر کے ممالک کو (بظاہر) بھاشن پر بھاشن دیے جا رہا تھا' آج اسی جمہوریت نے اُس کا یہ ظاہری پردہ چاک کر دیا ہے اور وہ نسل پرستی' بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے لق و دق صحرا میں کھڑا دنیا کی متحیّر نگاہوں کو از سرِ نو دھوکہ دینے کے اسباب تلاش کر رہا ہے۔ خود امریکہ میں اس ناگہانی تبدیلی کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں' توڑ پھوڑ اور پُرتشدد مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ سیاہ فام امریکی نسلی تعصّب کا شکار بننے کے خطرے کے پیشِ نظر دوسرے ممالک میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ صرف کینیڈا کی شہریت حاصل کرنے کے لیے کالے امریکیوں نے اتنی درخواستیں جمع کرائی ہیں کہ کینیڈا کی ویب سائیٹس کریش کر چکی ہیں۔ ان سیاہ فارم امریکیوں سمیت' امریکہ میں مقیم تمام غیر ملکی' خاص طور پر مسلمان شدید تحفّظات کا شکار ہو چکے ہیں' گویا ان کی آزادی سلب ہو چکی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس امریکہ میں ہو رہا ہے جو دنیا کو رواداری' مساوات اور انسانی حقوق کا درس دیا کرتا ہے۔

یہ سب کیسے ہو گیا؟ دنیا حیران ضرور ہے' لیکن اس کے اصل اسباب کو سمجھنے کے لیے اب بھی بالکل تیار نہیں ہے' بلکہ ''..... بیمار ہوئے جس کے سبب' اُسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں'' کے مصداق اب بھی جمہوریت کو ہی اپنے تمام تر مسائل کا حل سمجھ رہی ہے۔ مغربی میڈیا جمہوریت کو انسانی معاشرے کی سانس قرار دیتا ہے جس کے بغیر گویا زندگی کا تصور ممکن نہیں' جبکہ خود میڈیا کی ہر سانس سرمایہ دار کی فراہم کردہ آکسیجن کی محتاج ہے۔ مغربی اور مقامی میڈیا کے اسی پروپیگنڈا کے زیرِ اثر ترقی پذیر ممالک میں بھی تمام تر مسائل کا حل اور معاشرتی سدھار کا واحد ذریعہ جمہوریت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت ایک اچھا طرزِ حکومت ہے اور اپنی خالص شکل میں یورپ میں جہاں قائم ہے وہاں انسانیت اس کے ثمرات سے کسی قدر مستفید بھی ہو رہی ہے' لیکن زیادہ تر ممالک میں

جمہوریت کو سرمایہ داروں نے اپنے سرمائے کے تحفظ کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ جمہوریت میں اگرچہ عوام کو اپنے حکمرانوں کے انتخاب' حکومت بنانے اور گرانے کا حق حاصل ہے' لیکن سرمایہ دار میڈیا پر قابض ہونے کی وجہ سے اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں' لہٰذا ایوانِ اقتدار کی سیڑھیاں صرف سرمایہ دار یا سرمایہ داروں کے کٹھ پتلی سیاستدان ہی طے کر پاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی طرف سے جمہوریت کے حق میں پروپیگنڈا اس قدر تیز ترین اور شدید ترین ہوتا ہے کہ عوام کو یہ جمع تفریق کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس سرمایہ دارانہ جمہوریت نے اپنی دوسو سالہ تاریخ میں عوام کو دیا کیا ہے۔ دنیا میں جہاں بھی اس سرمایہ دارانہ جمہوریت کا غلبہ ہے وہاں اس نے عوام کو اگر کچھ دیا ہے تو قسطوں میں ضروریات زندگی کے حصول کی سہولت! جو کہ اسی نظام نے اب وہ بھی چھین لی ہے۔ وہ ممالک جو سب سے زیادہ جمہوریت کے طرفدار ہیں ان میں بھی اب غربت' بے روزگاری اور افلاس کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل کینیڈا میں ہزاروں افراد غربت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ وال سٹریٹ پر قبضہ کے مظاہرے تو دنیا بھر میں دیکھے گئے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے والے بھارت میں ۶۹ سال سے جمہوریت کا راج ہے اور اُس کی نصف سے زائد آبادی اب بھی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ جمہوریت نے اگر کسی کو کچھ دیا ہے تو وہ صرف سرمایہ دار طبقہ ہے۔ امریکہ ہو یا یورپ کا کوئی بھی ملک' بھارت ہو یا پاکستان' دنیا بھر میں جمہوریت نے صرف سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کو ہی تحفظ دیا ہے۔ جبکہ عوام کے حصے میں صرف محرومیاں آتی ہیں یا کھوکھلے وعدے۔ امریکہ' بھارت اور پاکستان سمیت کسی بھی ملک میں سوائے سرمایہ دار کے کوئی حکومت بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی سرمایہ دار حکومت میں آکر سرمایہ نکالنے کے لیے عام آدمی کا استحصال کرتا ہے اور پھر اس کی محرومیوں کو نسلی' علاقائی' مذہبی یا قومی تعصّبات سے انگیخت کر کے حکومت میں آنے کا راستہ بناتا ہے' جبکہ عوام اس کے شر انگیز بہکاوے میں آکر اپنی محرومیوں کا ازالہ قوم پرستی' نسل پرستی اور علاقائی اور مذہبی تعصب میں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا میں انسانی بنیادوں پر یگانگت اور وحدت پیدا کرنے کے بجائے قوم پرستی' نسل پرستی' انتہا پسندی' تقسیم و تفریق کو جنم دیا۔ اسی سرمایہ دارانہ نظام نے' جس نے جمہوری طرزِ حکومت کو یرغمال بنایا ہوا ہے' قومی مفادات کے تصور کو جنم دیا۔ اسی نے منڈیوں پر قبضے کی دوڑ میں دنیا کو پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کا وہ تحفہ دیا جس میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بنے۔ اسی نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کے فیصلے کیے جس میں لاکھوں انسان جل کر کوئلہ بن گئے' اسی نے دنیا کو عشروں تک سرد جنگ کی بھٹی میں جھونکے رکھا' اسی نے کوریا اور ویت نام کی جنگیں ایجاد کیں' اسی نے کوریا اور جرمنی کو تقسیم کرایا اور دیوارِ برلن کھڑی کی۔ اسی نے سیکولر سٹیٹ ہونے کے دعویدار بھارت میں ہزاروں مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام کرنے والے انتہا پسند ہندوؤں کے نمائندہ مودی کو وزیرِ اعظم بنا دیا۔ اسی نے ڈونلڈ ٹرمپ جیسے انتہا پسند اور بدکردار انسان کو امریکہ کا صدر بنا دیا۔ اور اسی سرمایہ دارانہ نظام کی لپیٹ میں آئی ہوئی جمہوریت نے دنیا میں انتہا پسندی

کوعروج دے کر آج دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

دنیا اس حقیقت کو تسلیم کرے یا نہ کرے‘ مگر سچ یہی ہے جس کا ہم بار بار اعادہ کر رہے ہیں کہ یہ طرزِ حکومت دراصل سرمایہ دار کی پیدا کردہ سوچ ہے اور اس کی اصل مادیت پسندی ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ یورپی اقوام نے برصغیر سمیت اپنی تمام نوآبادیات میں جاگیردارانہ نظام قائم کیا تھا اور یہ جاگیردار قابض اقوام کے لیے ٹیکس اکٹھا کرنے کے علاوہ قابض افواج کے لیے افرادی قوت بھی مہیا کرتے تھے۔ یہی جاگیردارانہ نظام کبھی یورپ میں بھی شخصی بادشاہتوں کے تحفظ کا ایک وسیلہ تھا اور یہی دو فرائض وہاں بھی سرانجام دے رہا تھا۔ لیکن جب یورپ میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا اور اُس کے نتیجے میں سرمایہ دار اُبھرنا شروع ہوئے تو ان سرمایہ داروں نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہی اور اُس کے لیے عوام کو آڑ بنایا۔ چنانچہ اس طرح یورپ میں جدید جمہوریت کی بنیاد پڑی جس میں عنانِ حکومت تو چالاک اور عیار سرمایہ دار کے پاس رہی لیکن عوام کو یہ لارا لگایا گیا کہ جمہوریت کا مطلب عوام کی حکومت‘ عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دار جمہوریت کو کس طرح استعمال کرتا ہے اس کا اندازہ اس تازہ مثال سے بھی لگایا جا سکتا کہ جس میں دو لاکھ ووٹوں کی برتری حاصل کرنے والی ہیلری کلنٹن ہار جاتی ہے اور عوام کی محرومیوں کو نسلی تعصب میں بدل کر ایک مسخرہ اور بدکردار سرمایہ دار امریکہ کا صدر بن جاتا ہے اور اکثریت کو حکومت کرنے کا حق دینے والی جمہوریت منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور دو سو سالہ عظیم جمہوریت کی مثال ہے‘ جبکہ جمہوریت کی اسی تعریف کے ساتھ پسماندہ ممالک میں عوام کا جس بری طرح سے استحصال ہو رہا ہے اس کو بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ایک تاریک پہلو یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یورپ میں عنانِ حکومت جاگیرداروں کے ہاتھ سے لینے کے بعد اسی نے سرمایہ کی دوڑ میں یورپی اقوام کو ایشیائی اور افریقی ممالک پر ناجائز قبضہ پر اُکسایا اور اپنی انہی نوآبادیات میں اپنے ناجائز قبضہ کے تحفظ کے لیے خود جاگیردارانہ نظام قائم کیا۔ یہ جاگیردار اور وڈیرے سرمایہ دار کے ساتھ مل کر آج بھی پاکستان جیسے ملک میں عوام کا استحصال کر رہے ہیں اور شاید صدیوں تک کرتے رہیں گے۔ اس لیے کہ یہ سرمایہ دار جمہوریت کی آڑ میں اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور وسائل کی لوٹ مار کا لائسنس حاصل کر لیتا ہے۔

آج پاکستان سمیت دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک جو بے چینی‘ اضطراب‘ انتشار اور افراتفری دیکھی جا رہی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سرمایہ دارانہ نظام ہے‘ جس نے انسانیت کو روحانی ترقی کی بجائے مادی ترقی کی دوڑ میں لگا کر انتشار‘ اضطراب اور افراتفری کا شکار کر دیا ہے‘ اور یہی اضطراب اور انتشار دنیا بھر میں انتہا پسندی اور شدت پسندی کا باعث بن رہا ہے‘ جس نے بالآخر دنیا کو ایک ہولناک تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

اس کے مقابلے میں خالقِ کائنات نے انسانیت کے لیے جو نظام تجویز کیا تھا وہ انسانیت میں اخوت و یگانگت‘ بھائی چارے‘ ایثار اور قربانی کے جذبات کو فروغ دینے والا تھا۔ اللہ کے آخری نبی ﷺ نے غیر اسلامی اور غیر انسانی امتیازات کا خاتمہ فرما کر پوری انسانیت اور مخلوق کو اللہ کا کُنبہ قرار دیا۔ آپ ﷺ نے عرب و عجم‘ کالے اور گورے ہر انسان کو آدم کی اولاد قرار دے کر پوری انسانیت کو ایک برادری اور مسلم اُمّہ کو جسدِ واحد‘ ایک امت قرار دیا‘ لیکن ان میں امتیاز صرف ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر ہوگا۔

اسلام نے اخوت‘ اجتماعیت اور فلاح انسانیت کا وہ تصور عطا کیا جس کی مثال پوری انسانیت اور مذاہب کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ کا یہ دین اپنی پوری شکل میں کہیں بھی عملی طور نافذ العمل ہوا تو وہاں عدل و انصاف کے مظاہر دنیا نے دیکھے۔ گورے‘ کالے‘ رنگ‘ نسل‘ زبان کی تفریق مٹ گئی۔ معاشی استحکام کے لحاظ سے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا‘ امن و امان کا یہ عالم تھا کہ اکیلی عورت ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ غیر مذہب بھی اللہ کے نازل کیے ہوئے نظام کے فطری ثمرات کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ اللہ کا یہ دین انسانیت کو مادیت کی دوڑ میں لگا کر اضطراب و انتشار پیدا کرنے‘ دلوں میں محرومیوں کا احساس موجزن کرنے اور اس کے نتیجہ میں نسلی‘ علاقائی اور لسانی تعصّبات پیدا کرنے کی بجائے روحانی تربیت کر کے ایک خالق کائنات کے حضور محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ یہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی ترغیب نہیں دیتا‘ بلکہ دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کا درس دیتا ہے۔ یہ اللہ کا باغی نہیں بناتا بلکہ اللہ کا ایسا فرمانبردار بندہ بناتا ہے جو پوری انسانیت کے لیے خیر کا موجب ہو‘ جس کا کردار و عمل اور ہر مشورہ انسانیت کے لیے سراسر بھلائی کا ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ اسلامی نظام کی بنیاد ان سنہری قرآنی اصولوں پر ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪﴾ ”اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور نماز قائم کی۔“ ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪﴾ ”اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔“ ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۸﴾ ”اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔“ (الشوریٰ)

اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام قائم ہی ظلم و بربریت اور استحصال پر ہوتا ہے اور غربت‘ افلاس‘ انتشار اور تعصّبات اس کے لازمی نتائج ہیں۔ یہی اس کی تاریخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام سراسر شر ہے‘ جو نہ صرف انسانوں کو ایک اللہ کی بندگی سے روکتا ہے بلکہ انہیں اللہ کا باغی بھی بناتا ہے۔ ربّ واحد کا اقرار درحقیقت انسانی فطرت کی پکار ہے اور اللہ اور اس کے احکامات کا انکار اصلاً انسانی فطرت کا مسخ ہونا ہے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ انسانیت کا دنیوی اور روحانی استحصال کرنے والے اور روئے ارضی پر بدترین اخلاقی‘ معاشی‘ سیاسی اور معاشرتی بحران کا باعث بننے والے اس دَجّالی نظام سے نجات حاصل کرنے اور اس کی جگہ اللہ کے نازل کیے ہوئے فطری دین کے غلبے کی جِدّوجُہد کرنے میں ہی انسانیت کی بھلائی ہے اور یہی فلاح اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ ❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ النَّمْل

آیات ۴۵ تا ۵۸

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ
یَخْتَصِمُوْنَ۝ قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا
تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ
طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۝ وَكَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ
یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ
ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا
وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا
دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ۝ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۝ وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ۝ وَلُوْطًا
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۝ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ
الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۝ فَمَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
یَّتَطَهَّرُوْنَ۝ فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِیْنَ۝
وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ۝ ع

آیت ۴۵ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ ’’اور ہم نے بھیجا تھا قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو کہ تم اللہ

کی بندگی کرو‘ تو اس پر وہ لوگ دو گروہ بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔‘‘

آیت ۴۶ ﴿قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ﴾ ’’اُس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں جلدی مچاتے ہو بُرائی کے لیے‘ بھلائی سے پہلے؟‘‘

تم لوگ اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب مانگنے میں کیوں جلدی مچا رہے ہو؟ سورۃ الاعراف میں ان کا یہ قول نقل ہو چکا ہے: ﴿یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ ’’اے صالح! لے آؤ ہم پر وہ عذاب جس کی تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو اگر تم واقعی رسولوں میں سے ہو!‘‘

﴿لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ ’’تم لوگ اللہ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے‘ تاکہ تم پر رحم کیا جائے!‘‘

آیت ۴۷ ﴿قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ﴾ ’’انہوں نے کہا کہ ہم منحوس سمجھتے ہیں تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو۔‘‘

ہمیں خدشہ ہے کہ آپ لوگوں کی نحوست کی وجہ سے ہم کسی آفت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

﴿قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ﴾ ’’اُس نے کہا کہ تمہاری نحوست کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے‘ بلکہ تم ایسے لوگ ہو جو آزمائے جا رہے ہو۔‘‘

آیت ۴۸ ﴿وَكَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ﴾ ’’اور اُس شہر میں نو (۹) بڑے بڑے سردار تھے‘ وہ زمین میں فساد مچاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔‘‘

آیت ۴۹ ﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ﴾ ’’انہوں نے کہا کہ تم سب آپس میں اللہ کی قسم کھا کر عہد کرو کہ ہم لازماً رات کو حملہ کریں گے اس پر اور اس کے گھر والوں پر‘‘

ان سب سرداروں نے مل کر حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ ان میں سے کوئی اکیلا یہ اقدام کر کے حضرت صالح علیہ السلام کے قبیلے کے ساتھ دشمنی مول نہیں لے سکتا تھا‘ اس لیے انہوں نے حلف اٹھوا کر سب کو اس پر آمادہ کیا۔ سب کو اس طرح اس مہم میں شامل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی شخص راز فاش نہ کر سکے۔ قبائلی روایات و قوانین کے تحت پورا قبیلہ بحیثیت مجموعی اپنے تمام افراد کے جان و مال کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے اور

اپنے کسی فرد کو کوئی گزند پہنچنے کی صورت میں پورا قبیلہ یک جان ہو کر اس کے بدلے کا اہتمام کرتا ہے۔ سورۂ ہودؑ میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگ بھی آپؑ کے خلاف ایسا ہی اقدام کرنا چاہتے تھے لیکن آپؑ کے قبیلے کے ڈر کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اپنی اس مجبوری کا اقرار انہوں نے ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ﴾ (آیت ۹۱) ''اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔''

خود محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف بھی مکہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ سب مشرکین آپؐ کے قتل کے درپے ہو گئے' مگر اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ان کا یہ اقدام ان کے قبائل کے درمیان کہیں خانہ جنگی کا باعث نہ بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی بعینہٖ وہی منصوبہ بنایا جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے بنایا تھا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک نوجوان اس عمل میں شریک ہو اور سب مل کر آپؐ پر حملہ کریں۔ اس طرح نہ تو یہ پتا چل سکے گا کہ اصل قاتل کون ہے اور نہ ہی بنو ہاشم سب قبائل سے بدلہ لینے کی جرأت کر سکیں گے۔

بہر حال حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے ان نو سرداروں نے باہم حلف اٹھا کر منصوبہ بنایا کہ وہ سب مل کر رات کو آپؑ کے گھر پر دھاوا بول دیں گے اور:

﴿ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ (۴۹) ''پھر ہم اُس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم تو اس کے گھر والوں کے قتل کے وقت موجود ہی نہیں تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔''

آیت ۵۰ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ (۵۰) ''اور انہوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔''

آیت ۵۱ ﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (۵۱) ''تو دیکھ لو کیا انجام ہوا ان کی چال کا' ہم نے انہیں اور ان کی پوری قوم کو ہلاک کر ڈالا۔''

یعنی اس قوم پر عذابِ الٰہی ٹوٹ پڑا اور ان نو سرداروں سمیت تمام منکرین ہلاک ہو گئے۔

آیت ۵۲ ﴿فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ﴾ ''تو یہ اُن کے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں' اس ظلم کے سبب جو انہوں نے کیا۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ (۵۲) ''یقیناً اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے

لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

آیت ۵۳ ﴿وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ (۵۳) ''اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی۔''

آیت ۵۴ ﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ﴾ (۵۴) ''اور لوطؑ کو بھی (ہم نے بھیجا) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم فحش کام کرتے ہو اور تم دیکھتے بھی ہو!''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ علی الاعلان اپنی مجالس کے اندر ایسی فحش حرکات کا ارتکاب کرتے تھے۔

آیت ۵۵ ﴿اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ (۵۵) ''کیا تم مَردوں کا رخ کرتے ہو شہوت رانی کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر! بلکہ تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔''

آیت ۵۶ ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ (۵۶) ''تو اُس کی قوم کا کوئی جواب نہیں تھا مگر یہ کہ انہوں نے کہا: نکال باہر کرو لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے۔ یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں!''

آیت ۵۷ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ﴾ (۵۷) ''تو ہم نے نجات دی اُسؑ کو اور اُسؑ کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے' جس کے بارے میں ہم نے طے کر دیا تھا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہو گی۔''

آیت ۵۸ ﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ (۵۸) ''اور ان کے اوپر ہم نے ایک بارش برسائی' تو بہت ہی بُری بارش تھی جو اُن لوگوں پر برسائی گئی جن کو خبردار کر دیا گیا تھا۔''

یہاں پر اس سورت کا انباء الرسل کا حصہ بھی اختتام پذیر ہوا۔ اب اس کے بعد کچھ حصہ التذکیر بآلاء اللہ پر مشتمل ہے اور یہ اس سورت کا بالکل منفرد انداز ہے۔

آیات ۵۹ تا ۶۴

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ
اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ
اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ
وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ
يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ
يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

آیت ۵۹ ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ کُل حمد اور کُل شکر اللہ کے لیے ہے‘ اور سلام ہے اُس کے ان بندوں پر جن کو اُس نے چُن لیا ہے۔‘‘

یعنی تمام انبیاء ورسل علیہم السلام اللہ کے چنے ہوئے لوگ تھے‘ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾

﴿ءٰٓاللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ’’کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو یہ شریک بناتے ہیں!‘‘

ذرا سوچو کہ اللہ کے مقابلے میں تمہارے ان معبودوں کی کیا حیثیت ہے؟ تم لوگ خود تسلیم کرتے ہو کہ تمام اختیارات کا مالک اللہ ہی ہے۔ تو پھر ان بے اختیار معبودوں کو تم کس حیثیت سے پوجتے ہو؟

آیت ۶۰ ﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ﴾ ’’بھلا کون ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا!‘‘

﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ﴾ ’’پھر اس کے ذریعے سے ہم نے پُررونق باغات اُگائے۔‘‘

﴿مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ﴾ ’’تمہارے لیے ممکن نہیں تھا کہ ان کے درختوں کو خود اُگا سکتے۔‘‘

متجسّسانہ سوالات (searching questions) کا یہ انداز بہت مؤثر ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے ان اشعار میں یہی مضمون بالکل اسی انداز میں پیش کیا ہے: ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟

کہ اللہ ہی ہواؤں کو چلاتا ہے‘ بارش برساتا ہے‘ موسموں کو سازگار بناتا ہے‘ اناج اگاتا ہے‘ غرض تمام امور اسی کے حکم اور اسی کی قدرت سے انجام پاتے ہیں۔ اللہ کی قدرت کاملہ کے بیان کا یہی انداز سورۃ الواقعہ میں بھی ملتا ہے۔

﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟‘‘

کیا ان سارے کاموں میں اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی شریک ہے؟

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾﴾ ’’بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (حق سے) انحراف کر رہے ہیں۔‘‘

آیت ۶۱ ﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ﴾ ’’بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور رواں کر دیے اس کے اندر دریا (اور ندیاں)‘ اور بنائے اس کے لیے لنگر (پہاڑ) اور بنایا دو دریاؤں کے درمیان پردہ؟‘‘

﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟‘‘

کیا کوئی ایسی دوسری ہستی تمہاری نظر میں ہے جو ان کاموں میں اللہ کے ساتھ شریک ہو؟

﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ ''بلکہ ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

تاویلِ خاص کے اعتبار سے ان آیات کے مخاطبینِ اوّلین مشرکینِ مکّہ تھے اور ان کے پاس ان پے در پے سوالات کا ایک ہی جواب تھا' اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے! اس حوالے سے ان کے خیالات' نظریات اور عقائد کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان کے شرک کی صورت اور نوعیت کیا تھی؟ چنانچہ اس سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ مشرکین مکہ اللہ کو معبود بھی مانتے تھے اور اس کو اس کائنات کا خالق بھی تسلیم کرتے تھے۔ البتہ کچھ شخصیات (جن کے بُت انہوں نے بنا رکھے تھے) کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کے لاڈلے' چہیتے اور مقرّبین ہیں اور وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں گے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (یونس:۱۸)۔ بس ان کا شرک اس سے زائد کچھ نہیں تھا۔

آیت ۶۲ ﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ ''بھلا کون ہے جو سنتا ہے ایک مجبور و لاچار کو جب وہ اس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟''

﴿وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور جو تمہیں جانشین بناتا ہے زمین میں؟''

کہ تمہاری ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس کی جانشین بنتی ہے اور یہ سلسلہ غیر منقطع طریقے سے اللہ تعالیٰ قائم رکھے ہوئے ہے۔

﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ ''کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ (ان کاموں میں شریک)؟ بہت ہی کم نصیحت ہے جو تم لوگ حاصل کرتے ہو۔''

آیت ۶۳ ﴿اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ﴾ ''بھلا کون ہے جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں؟ اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت دیتی ہوئی اپنے بارانِ رحمت کے آگے آگے؟''

﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾ ''کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟ بہت بلند و بالا ہے اللہ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جو بادلوں کے آگے آگے بارانِ رحمت کی نوید بن کر چلتے ہیں' کیا انہیں چلانے اور بحر و بر کی تاریکیوں میں تم لوگوں کو درست راستے سجھانے میں اللہ کے ساتھ کسی

دوسرے معبود کا بھی کوئی حصہ ہے؟

آیت ۶۴ ﴿اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''بھلا کون ہے جو ابتدا میں پیدا کرتا ہے مخلوق کو' پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تم لوگوں کو رزق دیتا ہے آسمانوں اور زمین سے؟''

﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦٤﴾﴾ ''کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟ آپؐ کہیے کہ لاؤ اپنی دلیل' اگر تم سچے ہو؟''

آیات ۶۵ تا ۸۱

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ
هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا
لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ
مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ
بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾
وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ
يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ
الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾

آیت ۶۵ ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ﴾ ''آپؐ کہہ

دیجیے کہ جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں‘ کسی کو بھی غیب کا علم نہیں سوائے اللہ کے۔‘‘

﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾ ’’اور انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا۔‘‘

یعنی وہ لوگ جو فوت ہو چکے ہیں‘ چاہے وہ اولیاء اللہ ہوں یا کوئی اور‘ اس دنیا سے جانے کے بعد وہ عالمِ برزخ میں ہیں اور وہاں انہیں کچھ معلوم نہیں کہ انہیں کب دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

آیت ۶۶ ﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫﴾ ’’بلکہ تھک ہار کر رہ گیا ہے ان کا علم آخرت کے بارے میں۔‘‘

یعنی یہ لوگ آخرت کی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے۔

﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾﴾ ’’بلکہ اس کے بارے میں وہ شک میں مبتلا ہیں‘ بلکہ اس کی طرف سے وہ اندھے ہو چکے ہیں۔‘‘

اگرچہ یہ لوگ زبانی طور پر آخرت کا اقرار بھی کرتے ہیں اور دوبارہ جی اٹھنے پر بظاہر ایمان بھی رکھتے ہیں‘ لیکن عملاً وہ اس کے منکر ہیں۔ عملاً انہیں آخرت کی زندگی کو سنوارنے یا قیامت کے احتساب سے بچنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس دنیا میں اپنے کل کی فکر انسان کو ہر وقت دامن گیر رہتی ہے‘ کہ کل کیا کھانا ہے اور باقی ضروریات کیسے پوری کرنی ہیں۔ اس لیے کہ اسے کل کے آنے پر پختہ یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر اسے واقعی یقین ہو کہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ ہونا ہے اور یہ کہ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے تو اس کے لیے وہ لازماً فکرمند بھی ہوگا اور اسے بہتر بنانے کی کوشش بھی کرے گا۔ لیکن کسی انسان کو عملاً اگر اس کی فکر نہیں ہے اور وہ اس کے لیے کوشش بھی نہیں کر رہا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے اس کے بارے میں یقین نہیں ہے۔

آیت ۶۷ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾﴾ ’’اور یہ کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے آباء و اجداد مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں پھر سے نکال لیا جائے گا؟‘‘

آیت ۶۸ ﴿لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ﴾ ’’یہی وعدہ ہم سے بھی کیا گیا

ہے اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اجداد سے بھی کیا گیا تھا۔‘‘

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾﴾ ’’یہ کچھ نہیں مگر پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔‘‘

آیت ۶۹ ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾﴾ ’’آپؐ کہیے کہ ذرا گھومو پھرو زمین میں اور دیکھو لو کہ کیسا انجام ہوا مجرم قوموں کا!‘‘

آیت ۷۰ ﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان پر رنجیدہ نہ ہوں‘ اور جو چالیں یہ چل رہے ہیں ان پر دل تنگ نہ کریں۔‘‘

مکہ کے ماحول میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کو شدید مخالفت اور دباؤ کا سامنا تھا‘ اس لیے مکی سورتوں میں یہ مضمون بار بار دہرایا گیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۱۲۷ میں یہ مضمون بالکل انہی الفاظ میں آیا ہے‘ جبکہ سورۃ الشعراء میں اس حوالے سے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے یوں فرمایا گیا ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس لیے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے‘‘۔ بہرحال مشرکینِ مکہ کے مخالفانہ رویّے کے باعث حضور ﷺ کو بار بار تسلی دی جاتی تھی کہ آپؐ نے ان تک ہمارا پیغام پہنچا کر ان پر حجت قائم کر دی ہے اور یوں آپؐ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب آپؐ ان کی پروا نہ کریں اور نہ ہی ان کے بارے میں رنجیدہ ہوں۔ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ ہماری تدابیر ان کی چالوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ہماری قدرت کے سامنے ان کی سازشیں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔

آیت ۷۱ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾﴾ ’’اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا‘ اگر آپ سچے ہیں؟‘‘

یعنی آپ ہمیں مسلسل دھمکیاں دیے جا رہے ہیں کہ اگر ہم آپ کی اطاعت نہیں کریں گے تو ہم پر عذاب آ جائے گا۔ چنانچہ اگر آپ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ذرا یہ بھی بتا دیں کہ وہ عذاب کب آئے گا؟

آیت ۷۲ ﴿قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾ ’’آپؐ کہہ دیجیے کہ ہو سکتا ہے جس چیز کی تم لوگ جلدی مچا رہے ہو اُس کا کچھ حصہ

تمہارے قریب ہی آ لگا ہو۔‘‘

’’رَدِفَ‘‘ کے معنی گھوڑے پر دوسری سواری کے طور پر سوار ہونے کے ہیں۔ اس طرح پچھلا سوار اپنے آگے والے کی پیٹھ کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے کی وجہ سے ’’ردیف‘‘ کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم جس عذاب کے بارے میں بے صبری سے بار بار پوچھ رہے ہو وہ اب تمہاری پیٹھ کے ساتھ آ لگا ہے‘ بس اب تمہاری شامت آنے ہی والی ہے۔ ان الفاظ میں غالباً غزوۂ بدر کی طرف اشارہ ہے جس میں مشرکین مکہ کو عذابِ الٰہی کی پہلی قسط ملنے والی تھی۔

آیت ۷۳ ﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ ’’اور یقیناً آپؐ کا رب بڑے فضل والا ہے لوگوں کے حق میں‘‘

یعنی ابھی تک اگر تم لوگوں پر عذاب نہیں آیا تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا مظہر ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ بہت فضل اور کرم کا معاملہ کرتا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ ’’لیکن ان کی اکثریت شکر نہیں کرتی۔‘‘

آیت ۷۴ ﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ ’’اور یقیناً آپؐ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں ان کے سینے اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے کیا کہتے ہیں اور ان کے دلوں میں کیا جذبات ہیں۔ ان کے دل تو گواہی دے چکے تھے کہ محمد (ﷺ) سچے ہیں اور قرآن بھی برحق ہے‘ لیکن وہ محض حسد‘ تکبّر اور تعصب کے باعث انکار پر اڑے ہوئے تھے۔ اس حوالے سے ان کی کیفیت فرعون اور قومِ فرعون کی کیفیت سے مشابہ تھی جس کا حال اسی سورت کی آیت ۱۴ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ ’’اور انہوں نے ان (آیاتِ الٰہی) کا انکار کیا ظلم اور تکبر کے ساتھ جبکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا‘‘۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۶ اور سورۃ الانعام کی آیت ۲۰ میں علماءِ اہلِ کتاب کی بالکل یہی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ یعنی وہ اللہ کے رسول ﷺ اور قرآن کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

آیت ۷۵ ﴿وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ ’’اور

نہیں ہے کوئی پوشیدہ چیز آسمان اور زمین میں مگر وہ ایک روشن کتاب میں موجود ہے۔‘‘

گویا اللہ تعالیٰ کے علم قدیم ہی کو یہاں کتاب مبین کہا گیا ہے۔

آیت ۷۶ ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ ’’یقیناً یہ قرآن کھول کر بیان کر رہا ہے بنی اسرائیل پر اکثر وہ باتیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔‘‘

تورات کا نزول قرآن سے دو ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ اصل کتاب مدتوں پہلے گم ہو چکی تھی‘ پھر ایک عرصے بعد اسے یادداشتوں کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا گیا اور بنی اسرائیل نے اپنی من پسند روایات کے ذریعے سے بہت سی غلط باتیں اللہ سے منسوب کر دیں۔ جیسے اقبال نے کہا ہے: ع ’’یہ اُمّت روایات میں کھو گئی!‘‘ بہرحال قرآن نے ہر چیز کو کھول کر بیان کر دیا اور حقیقت ہر پہلو سے منکشف ہو گئی۔

آیت ۷۷ ﴿وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور یقیناً یہ (قرآن) ہدایت اور رحمت ہے اہلِ ایمان کے حق میں۔‘‘

آیت ۷۸ ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ﴾ ’’یقیناً آپؐ کا رب فیصلہ کر دے گا ان کے درمیان اپنے حکم سے۔ اور وہ زبردست ہے‘ سب کچھ جاننے والا۔‘‘

آیت ۷۹ ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ توکل کیجیے اللہ پر۔ یقیناً آپؐ ہی واضح حق پر ہیں۔‘‘

آپؐ کی دعوت میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں۔ آپؐ کا موقف حق وصداقت پر مبنی ہے۔

آیت ۸۰ ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ ’’البتہ آپؐ مُردوں کو نہیں سنا سکتے‘‘

یعنی آپؐ کے ان مخاطبین میں سے اکثر لوگوں کے دل مردہ ہیں‘ ان کی روحیں ان کے دلوں کے اندر دفن ہو چکی ہیں۔ یہ لوگ صرف حیوانی طور پر زندہ ہیں جبکہ روحانی طور پر ان میں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ابوجہل اور ابولہب کو آپ زندہ مت سمجھیں‘ یہ تو محض چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔ اس کیفیت میں وہ آپؐ کی ان باتوں کو کیسے سن سکتے ہیں! میر درد نے اپنے اس شعر میں انسان کی اسی روحانی زندگی کا ذکر کیا ہے: ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

﴿وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝۸۰﴾ ''اور نہ آپؐ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چل پڑیں۔''

یعنی ایک بہرا شخص آپ کے روبرو ہو' آپ کی طرف متوجہ ہو تو پھر بھی امکان ہے کہ آپ اشارے کنائے سے اپنی کوئی بات اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں' لیکن جب وہ پلٹ کر دوسری طرف چل پڑے تو اسے کوئی بات سمجھانا یا سنانا ممکن نہیں رہتا۔

آیت ۸۱ ﴿وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ﴾ ''اور نہ ہی آپؐ اندھوں کو ان کی گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے ہیں۔''

﴿اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۸۱﴾ ''آپؐ نہیں سنا سکتے مگر صرف انہی کو جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ فرمانبرداری کی روش اختیار کرتے ہیں۔''

آیات ۸۲ تا ۹۳

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝۸۲ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝۸۳ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸۴ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝۸۵ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۸۶ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۝۸۷ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝۸۸ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝۸۹ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ

تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۱ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝۹۲ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳

آیت ۸۲ ﴿وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ﴾ ''اور جب ان پر ہماری بات واقع ہو جائے گی تو ہم نکالیں گے ان کے لیے زمین سے ایک جانور جو ان سے کلام کرے گا''

﴿اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝۸۲﴾ ''کہ لوگ ہماری نشانیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔''

''دابّۃ الارض'' کا ظہور قیامت کی آخری علامات میں سے ہے۔ احادیث کے مطابق سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد کوہِ صفا پھٹے گا اور اس میں سے یہ جانور برآمد ہوگا۔ واللہ اعلم!

آیت ۸۳ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝۸۳﴾ ''اور ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن ہم جمع کریں گے ہر اُمّت میں سے ایک فوج اُن لوگوں میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے' پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔''

گویا ان مجرموں کے جرائم مختلف درجوں میں ہوں گے۔ ان میں سے کوئی انکار میں بہت زیادہ سخت تھا' کسی کی طبیعت میں کچھ نرمی کا پہلو تھا' کوئی تکذیب کے ساتھ ساتھ استہزاء کرنے کا مجرم بھی تھا۔ چنانچہ ان کے جرائم کی نوعیت اور کیفیت کے مطابق ان کی گروہ بندی کی جائے گی۔ یہ طریقہ انسانی فطرت اور طبیعت کے عین مطابق ہوگا کیونکہ سب انسان برابر نہیں۔ نہ تو اہل ایمان سب کے سب برابر ہیں اور نہ کفار و مشرکین سب ایک جیسے ہیں۔ ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

آیت ۴۴ ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ سب آ جائیں گے تو اللہ فرمائے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا تھا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہیں کیا تھا؟ یا تم لوگ کیا کرتے رہے تھے؟''

یعنی کیا تم لوگ واقعتاً میری آیات کو سمجھ نہیں سکے تھے یا پھر سمجھنے کے بعد تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا انکار کرتے رہے تھے؟

آیت ۸۵ ﴿وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور واقع ہو جائے گی ان پر بات' اس لیے کہ وہ ظلم کے مرتکب ہوئے تھے' چنانچہ وہ بول نہیں سکیں گے۔''

جب حقیقت ان پر واضح کر دی جائے گی تو وہ بول نہیں سکیں گے' اس لیے کہ ان کے دل تو دعوتِ حق کی حقانیت پر گواہی دے چکے تھے' لیکن اپنی ضد' ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنا پر انہوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا تھا۔ قبل ازیں اسی سورت کی آیت ۱۴ میں ایسے منکرین کے انکار کی کیفیت پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ﴾ کہ ان کے دلوں نے آیاتِ الٰہیہ کا یقین کر لیا تھا مگر وہ محض ضد' ظلم اور سرکشی کی بنا پر نہیں مانے تھے۔

آیت ۸۶ ﴿اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ﴾ ''کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے بنایا ہے رات کو تا کہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا ہے!''

اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے تحت رات کو سکون کے لیے جبکہ دن کو معاشی جدوجہد کے لیے سازگار بنایا ہے۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔''

آیت ۸۷ ﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو گھبرا اٹھیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' سوائے ان کے جنہیں اللہ (محفوظ رکھنا) چاہے۔''

نفخِ صُور سے ایک عمومی گھبراہٹ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات پر طاری ہو جائے گی'

سوائے ان کے جنہیں اللہ خود اس سے محفوظ رکھنا چاہے۔ جیسے آسمانوں پر فرشتے۔

﴿وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''اور سب حاضر ہو جائیں گے اُس کے آگے عاجزی کے ساتھ۔''

اُس دن سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکائے مؤدّب کھڑے ہوں گے۔

آیت ۸۸ ﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ﴾ ''اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ خوب جمے ہوئے ہیں' اور (اُس دن) وہ چلیں گے جیسے بادل چلتے ہیں۔''

پہاڑ اس دن بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہوائی سفر کے دوران ہم میں سے اکثر نے بادلوں کی ماہیت کا قریب سے مشاہدہ کیا ہوگا۔ یہ بظاہر دیکھنے میں ٹھوس نظر آتے ہیں لیکن جہاز بغیر کسی رکاوٹ کے انہیں چیرتے ہوئے آگے گزر جاتا ہے۔ قیامت کے دن پہاڑوں کی ٹھوس حیثیت کو ختم کر دیا جائے گا اور وہ ذرّات کے غبار میں تبدیل ہو کر بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔

﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ﴾ ''یہ اللہ کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنایا ہے۔''

یہ اللہ کی صنّاعی کا کرشمہ ہے کہ اُس نے اِس وقت پہاڑوں کو ایسی محکم اور ٹھوس شکل دے رکھی ہے' لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے انہیں دھنکی ہوئی روئی کے گالوں اور بادلوں کی طرح بے وزن اور نرم کر دے گا۔

﴿اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''یقیناً وہ ہر اُس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔''

آیت ۸۹ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ﴾ ''جو کوئی بھی (اُس دن) نیکی لے کر آئے گا تو اُس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہوگا۔''

ایک نیکی کا اجر دس گنا بھی ہو سکتا ہے' سات سو گنا بھی اور اس سے بھی زیادہ۔ بہر حال نیکی کا بدلہ بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا۔

﴿وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾ ''اور وہ اُس دن کی گھبراہٹ سے امن

میں ہوں گے۔‘‘

اس سے قیامت کے دن کی گھبراہٹ مراد ہے جسے سورۃ الحج کی پہلی آیت میں ﴿اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ (۱)﴾ کہا گیا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ قیامِ قیامت سے پہلے اللہ تعالیٰ مؤمنین صادقین کو سکون کی موت عطا کر کے اس دن کی گھبراہٹ سے بچا لے گا۔ اس کے علاوہ ان الفاظ میں اس مفہوم کی گنجائش بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بعث الموت کے بعد میدانِ حشر کی گھبراہٹ سے بھی محفوظ رکھے گا۔

آیت ۹۰ ﴿وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ ؕ﴾ ’’اور جو کوئی بُرائی لے کر آئے گا تو ایسے لوگوں کے منہ آگ میں اوندھے کر دیے جائیں گے۔‘‘

یعنی ان لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

﴿هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۹۰)﴾ ’’(اور کہا جائے گا کہ) تمہیں بدلے میں وہی تو دیا جا رہا ہے جو تم عمل کرتے رہے ہو۔‘‘

یعنی اس سزا کی صورت میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی‘ بلکہ تمہارے اعمال کے عین مطابق ہی تمہیں بدلہ مل رہا ہے۔

آیت ۹۱ ﴿اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الۡبَلۡدَةِ الَّذِیۡ حَرَّمَهَا﴾ ’’(دیکھو!) مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اِس شہر کے رب کی جس نے اسے محترم قرار دیا ہے‘‘

ان آخری آیات کا انداز ایک اعلان کا سا ہے۔ اگرچہ اس اعلان کا آغاز لفظ ’’قُــلۡ‘‘ سے نہیں ہو رہا لیکن انداز یہی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کر دیجیے۔ آپ ان پر واضح کر دیجیے کہ میں کسی بُت‘ کسی دیوی یا کسی دیوتا کی پرستش کی بجائے صرف اُس رب کی بندگی کرتا ہوں اور اسی کی بندگی کرتا رہوں گا جس نے بیت اللہ کو حرم ٹھہرایا ہے اور اس شہر کی سرزمین کو محترم قرار دیا ہے۔

﴿وَّلَهٗ کُلُّ شَیۡءٍ ۫ وَّاُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (۹۱)﴾ ’’اور اُسی کے اختیار میں ہے ہر چیز‘ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں شامل ہو جاؤں اُس کے فرمانبردار بندوں میں۔‘‘

آیت ۹۲ ﴿وَاَنۡ اَتۡلُوَا الۡقُرۡاٰنَ ۚ﴾ ’’اور یہ کہ میں تلاوت کروں قرآن کی!‘‘

مجھے تیسرا حکم یہ ملا ہے کہ میں قرآن پڑھوں‘ پڑھ کر لوگوں کو سناتا رہوں اور اس کی تبلیغ کرتا رہوں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۷ میں بھی آپؐ کو ایسا ہی حکم دیا گیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ﴾ کہ اے نبی ﷺ! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے اور اگر بالفرض آپ نے ایسا نہ کیا تو یہ گویا رسالت کے فرائض میں کوتاہی شمار ہوگی۔

﴿فَمَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ﴾ ’’تو جو کوئی ہدایت پائے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت پائے گا۔‘‘

اس ہدایت کے بدلے میں اگر وہ آخرت میں کامیاب قرار پاتا ہے اور اسے ﴿فَرَوۡحٌ وَّرَیۡحَانٌ ۬ۙ وَّجَنَّتُ نَعِیۡمٍ (۸۹)﴾ (الواقعة) سے نوازا جاتا ہے تو اس میں اس کا اپنا ہی بھلا ہے۔

﴿وَمَنۡ ضَلَّ فَقُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ (۹۲)﴾ ’’اور جو کوئی گمراہی کی روش اختیار کرے تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں!‘‘

جیسے کسی خطبہ کے آخر میں یہ الفاظ کہے جاتے ہیں: وَاٰخِرُ دَعۡوَانَاۤ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ بالکل اسی انداز میں اب اس سورت کا اختتام ہو رہا ہے:

آیت ۹۳ ﴿وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِهٖ فَتَعۡرِفُوۡنَهَا ؕ﴾ ’’اور آپؐ کہہ دیجیے کہ کُل حمد اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے‘ عنقریب وہ تمہیں اپنی آیات دکھائے گا تو تم انہیں پہچان لو گے۔‘‘

﴿وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (۹۳)﴾ ’’اور آپ کا رب غافل نہیں ہے اُس سے جو اعمال تم کر رہے ہو۔‘‘

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ' ونفعنی وایاکم بالآیات والذّکر الحکیم OO

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

فکرِ آخرت

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

تنظیم اسلامی کا گزشتہ سالانہ اجتماع ۱۰ تا ۱۲/اپریل ۲۰۱۵ء کو مرکزی اجتماع گاہ بہاولپور میں منعقد ہوا تھا‘ جس کے اختتام پر محترم امیر تنظیم اسلامی نے حسب روایت اختتامی خطاب فرمایا۔ حالیہ سالانہ اجتماع (۲۵ تا ۲۷ نومبر ۲۰۱۶ء) کے موقع پر رفقاء و احباب کے لیے تذکیر و موعظت کے طور پر یہ خطاب میثاق میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی ترتیب و تسوید قرآن اکیڈمی شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد نے کی ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۷﴾ (الاعلیٰ)

معزّز رفقائے گرامی! —— میں اپنی گفتگو کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور خاص طور پر اہلِ جنّت کی اُس جامع دعا سے کر رہا ہوں جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے۔ یہ بڑی جامع دعا ہے‘ آپ بھی اس میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ اہلِ جنت اُس روز کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳) ’’کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا‘ اور ہم ہرگز یہاں پہنچنے والے نہ تھے اگر اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی اور دست گیری نہ فرماتا‘‘ —— یہ اجتماع اگر منعقد ہوا ہے تو اللہ عزّوجل کے خاص فضل و کرم‘ اُس کی تائید اور اُس کی خاص توفیق سے۔ اس پر ہمیں قلب کی گہرائیوں سے اللہ کی بارگاہ میں ہدیۂ تشکّر پیش کرنا ہے۔

یہ اجتماع چند اعتبارات سے خصوصی کیفیت کا حامل رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا انعقاد ہی شکوک و شبہات کا شکار تھا۔ جو تاریخیں طے کی گئی تھیں‘ چند وجوہات کی بنا پر اُن میں یہ منعقد نہیں ہو سکا‘ لیکن بالآخر الحمدللہ اس کا موقع اللہ نے ہمیں نصیب فرمایا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ

بڑے ہی شارٹ نوٹس پر اس کا انعقاد ہوا ہے اور ہم بہت زیادہ ساتھیوں کی شرکت کی توقع بھی نہیں کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنے شارٹ نوٹس پر سب کے لیے آنا ممکن نہیں ہوگا‘ لیکن بہت حوصلہ افزا بات ہے کہ رفقاء کی کثیر تعداد نے دین کی اس پکار پر لبیک کہا اور انتہائی کم وقت کے اعلان کے باوجود ماشاء اللہ جوق در جوق یہاں پہنچے ہیں۔ پھر یہ ایک بڑا چیلنج اور ٹیسٹ تھا ہمارے ملتان کے ساتھیوں کے لیے‘ کیونکہ اجتماع کی میزبانی کے فرائض ان کے ذمے تھے اور انھیں دو مرتبہ کاروانِ بہار (اجتماع گاہ) کو خیمہ زن کرنا پڑا ہے‘ بقولِ اقبال ع ’’ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار‘‘۔ بہرحال ان کا اجر بھی ان شاء اللہ دوہرا ہوگا۔

تیسری خاص بات یہ ہے کہ اس بار موسم بھی ناسازگار تھا اور اس قسم کی صورتِ حال اس سے پہلے ہمیں پیش نہیں آئی۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک مرتبہ یہ دیکھتے ہوئے کہ انتظامیہ کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے‘ ہم نے ایسے وقت میں اجتماع کا انعقاد کیا جو عام طور پر دینی جماعتوں کے اجتماع کے لیے نامناسب وقت سمجھا جاتا ہے۔ یہ جنوری کا دوسرا ہفتہ تھا اور سردی کے شدید ترین دن تھے۔ ہم نے شدید سردی میں اجتماع رکھا تھا‘ لیکن الحمدللہ‘ سردی کے علاوہ اور کوئی رکاوٹ موسمی اعتبار سے پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ایک طوفانی ہوا چلی اور ایسا تیز جھکڑ چلا کہ ایک وقت تو یوں لگ رہا تھا کہ شاید ہمیں بساط لپیٹنی پڑے گی جب سارے خیمے زمین بوس ہو چکے تھے اور ایک ہنگامی اور افراتفری کی کیفیت بن گئی تھی‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی ہمیں سرخرو کیا۔ یہ اُسی کا فضل ہے اور پورے خلوص کے ساتھ اس کا شکر ہم پر لازم ہے۔

الحمدللہ‘ یہ اجتماع بخیر و عافیت اپنے طے شدہ وقت پر پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے ع ’’ایں سعادت بزورِ بازو نیست!‘‘ اس مرتبہ اجتماع کا مرکزی موضوع ’’فکرِ آخرت‘‘ تھا۔ الحمدللہ ہمارے مقررین ساتھیوں نے موضوع کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ اس پر وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں‘ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم سے نوازے۔ انہوں نے مکمل تیاری سے مضمون کا حق ادا کرتے ہوئے گویا ہم تک پورا پیغام پہنچایا ہے اور اس موضوع کے ضمن میں پورے تنظیمی فکر کا ایک بار پھر سے اعادہ (revision) ہو گیا ہے‘ بلکہ overhauling ہو گئی ہے۔

گزشتہ سال ۲۰۱۴ء میں اجتماع کا موضوع ’’حُبِّ رسول ﷺ اور اس کے تقاضے‘‘ تھا‘ جو اپنی جگہ بہت اہم ہے‘ لیکن بہرحال اس بار کا موضوع ’’فکرِ آخرت‘‘ بہت سے اعتبارات سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے موضوع سے زیادہ ایک پیغام اور اِنذار (warning) کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

دنیا دارالامتحان ہے اور یہ امتحان لازمی ہے!

فکرِ آخرت اور انذارِ آخرت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ذکر سے قرآن کا کوئی صفحہ خالی نہیں ہے‘ گویا اس کا بیان قرآن مجید میں سب سے زیادہ ہے —— دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ’’لازمی امتحان‘‘ میں ڈالا ہے۔ ’’لازمی امتحان‘‘ کا یہ لفظ میں نے دانستہ طور پر اختیار کیا ہے‘ اس لیے کہ موجودہ دور کے دانشوروں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی درحقیقت دارالامتحان ہے اور اس کا رزلٹ دوسرے عالَم میں ظاہر ہوگا تو بعض ابلیسی سوچ کے حامل دانشور یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہم تو امتحان نہیں چاہتے تھے‘ ہمیں تو زبردستی اس امتحان میں ڈالا گیا ہے‘ اس لیے یہ ایک طرح سے ہم پر ظلم ہے۔ بہر حال ایک بات تو صحیح ہے کہ یہ امتحان اللہ کی طرف سے ہے اور اس کے لیے ہمارے پاس کوئی اختیار (option) نہیں تھا کہ ہم اس امتحان میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ دنیا کے امتحانات میں تو انسان کو اختیار حاصل ہوتا ہے‘ لیکن اس امتحان میں ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے اور یہ امتحان لازمی درجے میں ہے جس سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے۔

ان کی دوسری بات کہ ’’یہ ایک طرح سے ہم پر ظلم ہے‘‘ تو اس کا جواب میں یہ دیا کرتا ہوں کہ اگر اس بات کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کتنا عظیم موقع ہمیں دیا ہے کہ یہ مختصر سی زندگی ہم اپنے رب کی مرضی کے مطابق گزار لیں اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں اور باتوں سے بچے رہیں تو پھر ابدالآباد تک ہمارے لیے وہ نعمتیں ہیں کہ جن کے بارے میں حدیث مبارکہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ)) (متفق علیہ)

کہ ان نعمتوں کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے ان کے بارے میں سنا اور نہ کسی شخص کے دل میں ان کا کوئی خیال تک گزرا۔ چنانچہ یہ ظلم نہیں ہے‘ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوعِ انسان کے لیے بہت بڑا انعام اور بہت بڑا موقع ہے کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر ہم ہمیشہ ہمیش کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

بہر حال یہ امتحان لازمی ہے اور اس امتحان کی نوعیت آر یا پار اور تخت یا تختہ کی ہے۔ دوسری طرف عام دنیوی امتحانات کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ ان میں کامیاب ہو گئے تو زیادہ مواقع مل جائیں گے اور ذرا قدرے بہتر زندگی گزار لیں گے۔ ان میں یہ نہیں ہوتا کہ اگر امتحان

میں ناکام ہوئے تو پھر ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں جاؤ گے۔ دنیا کے امتحانات میں تو یہ تصور نہیں ہے‘ لیکن آخرت کے امتحان میں ناکامی کسی صورت برداشت (afford) نہیں کی جاسکتی۔ اگر انسان عقل اور دیانت سے سوچے تو اسے احساس ہوگا کہ جس امتحان میں اللہ نے ہمیں ڈالا ہے‘ اس میں کوئی رِسک (risk) نہیں لیا جاسکتا‘ اس لیے کہ اس میں ناکامی کا مطلب ابدالآباد تک کے لیے جہنم کی آگ میں جلنا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی بہت سے لوگ رِسک لیتے ہیں اور ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾﴾ (البقرۃ) ’’تو یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر!‘‘ یعنی انہوں نے بہت بڑا جگرا پایا ہے اور ان کے اندر بڑا حوصلہ ہے کہ یہ اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ انہیں جہنم میں ابدالآباد تک جھونک دیا جائے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس امتحان میں ناکامی کا مطلب اس دنیا کی آگ جس میں ہم چند لمحوں کے لیے اپنی ایک انگلی رکھنے کو تیار نہیں‘ اس سے کئی ہزار گنا سخت آگ میں ہمیشہ ہمیش کے لیے جلایا جانا ہے۔ چنانچہ انذارِ آخرت یہ ہے کہ اس سے بچنے کی کوشش کرو! تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اس آگ سے بچنے کی ہی دعوت دیتے رہے ہیں اور لوگوں کو باور کراتے رہے ہیں کہ ہمیشہ ہمیش کی زندگی کو چھوڑ کر مختصر زندگی کے بارے میں فکر کرنا‘ بہت بڑا نقصان ہے‘ لہٰذا اس نقصان سے بچو۔ رسولوں کا تو کام ہی انذار سے شروع ہوتا تھا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (النساء:۱۶۵) ’’یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر‘‘۔ یعنی رسول مبشر بھی ہیں اور منذر بھی‘ لیکن انذار والا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ بانیٔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اپنے دروسِ قرآنی میں یہ بات بہت عمدہ طریقے سے واضح کی ہے کہ رسولوں کی دعوت میں اصل زور انذار پر تھا اور یہی چیز نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی دعوت میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ فترۃ الوحی کے بعد آنے والی پہلی وحی میں ہی رسول اللہ ﷺ کو انذار کا حکم دے دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿٢﴾﴾ ’’اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! آپ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے‘‘۔ اسی طرح پورے قرآن کی دعوت کا مرکز و محور بھی انذار ہی ہے۔ قرآن مجید کا خلاصہ سورۃ العصر میں بیان کر دیا گیا ہے‘ فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿٢﴾﴾ ’’قسم ہے گزرتے ہوئے زمانے کی‘ پوری نوعِ انسانی یقینی طور پر بڑے خسارے سے دوچار ہونے والی ہے‘‘۔ جبکہ اگلی آیت میں اس خسارے سے بچنے کی طرف دعوت دی گئی ہے اور چار شرطیں بیان کی گئی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اس امتحان میں سرخرو ہو سکتا ہے اور خسارے سے بچ سکتا ہے۔

اصل کامیابی جہنم سے چھٹکارا پانا ہے!

خسارے‘ ناکامی اور جہنم کے عذاب سے بچنے کی دعوت آپ کو قرآن مجید میں جا بجا ملے گی‘ مثلاً سورۃ التحریم میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ (آیت ۶) ’’اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے‘‘۔ اسی طرح سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰﴾ ’’اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟‘‘

قرآن مجید کی نظر میں اصل کامیابی جہنم کی آگ سے بچایا جانا ہے‘ مگر بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ ۝۱۷۵﴾ (البقرۃ) ’’تو یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر!‘‘ کا مصداق بنے ہوئے ہیں اور اُن کی سوچ یہ بن گئی ہے کہ گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالآخر جنت میں چلے ہی جانا ہے‘ تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں ایک لمحے کے لیے رکنا بھی سینکڑوں ہزاروں سالوں کے برابر ہوگا اور یہ رکنا اپنی جگہ قیامت سے کم نہیں ہوگا۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اصل کامیابی جہنم سے بچ جانا ہے: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) ’’پس جو کوئی بچا لیا گیا جہنم سے اور داخل کر دیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا۔‘‘ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ اے اللہ! ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمانا!)

چنانچہ اسی معاملے کو آگے بڑھاتے ہوئے قرآن مجید اس حقیقت پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے کہ انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی اپنی ذات کے حوالے سے دنیا میں رہتے ہوئے سب سے بڑے مسائل وہ نہیں ہیں جن کو وہ اپنے مسائل سمجھتا ہے اور جس مسئلہ کی سب سے زیادہ اسے فکر ہونی چاہیے‘ اس سے وہ سب سے زیادہ غافل ہے۔ دنیا میں انسان سمجھتا ہے کہ مجھے اپنی ذات کا تحفظ کرنا ہے اور اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ پھر اُس کے لیے معاش سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ اچھی جاب مل جائے‘ مستقبل اچھا ہو جائے‘ تو انسان اسی کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ انسان کا ایک اور بڑا مسئلہ اولاد کا پیٹ پالنا اور اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ بڑھاپا کیسے گزرے گا؟ لہٰذا اس کے لیے ابھی سے تیاری کرنی ہے‘ اس کے لیے پیسہ جمع کرنا ہے۔ انسان ان تمام معاملات کو اپنے لیے بڑے بڑے مسائل گردانتا ہے‘

لیکن قرآن کے نزدیک ان میں سے کوئی ایک بھی حقیقی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ کیسے پالیں گے‘ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ نہ تم اپنے رازق ہو نہ اپنی اولاد کے‘ بلکہ: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ﴾ (بنی اسرائیل: ۳۱) ’’ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی‘‘۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں جو رزق مل رہا ہے وہ تمہاری اپنی محنت اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے‘ تمہارے حقیقی رازق ہم ہیں اور جیسے ہم تمہیں رزق دے رہے ہیں اسی طرح تمہاری اولاد کے رزق کا بندوبست بھی ہمارے ذمہ ہے۔ سورۃ الطلاق میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ﴾ (آیت ۳) ’’اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا‘ اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ پر توکّل کرتا ہے تو اُس کے لیے وہ کافی ہے‘‘۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکّل کر کے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب رازق وہ ہے تو پھر رزق کوئی مسئلہ نہیں ہے‘ جسے انسان اپنے لیے سب سے بڑا مسئلہ سمجھ رہا ہے۔

زندگی کے قیمتی لمحات اُخری کامیابی کے لیے صَرف کریں!

پس جان لیجیے کہ اصل اور حقیقی مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دنیا واحد موقع ہے عذابِ جہنم سے بچنے کے لیے‘ لہٰذا جو بھاگ دوڑ کرنی ہے وہ یہاں پر رہتے ہوئے موت سے پہلے پہلے کر لی جائے۔ یہ ہے اصل اور حقیقی مسئلہ! لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ محدود لمحات نامعلوم کب ختم ہو جائیں اور آخری وقت آ جائے۔ ہم پلاننگ تو لمبی لمبی کرتے ہیں‘ لیکن کل کا پتا نہیں ہے کہ کل تک میں زندہ بھی رہوں گا یا یہ مہلت کل سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔ ایک دفعہ یہ مہلت ختم ہو گئی تو پھر دوبارہ کوئی چانس نہیں ہے۔ قیامت میں لوگ چیخیں گے‘ چلائیں گے اور کہیں گے کہ اے اللہ! ہمیں ایک موقع اور دے دے‘ پھر دیکھ ہم کیسے نیک کام کریں گے‘ تیرے بندے بن کر زندگی گزاریں گے‘ مقامِ احسان تک پہنچ جائیں گے‘ بس ایک موقع اور دے دے۔ لیکن اس وقت موقع نہیں ملے گا۔ لہٰذا یہ لمحات انتہائی قیمتی ہیں اور انہیں دنیا نہیں‘ بلکہ اُخروی کامیابی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ دنیا

پرست لوگ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ وقت کی قدر و قیمت ہونی چاہیے‘ بڑے قیمتی لمحات ہیں‘ لہٰذا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے‘ لیکن سوچ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ یہ لمحات آخرت بنانے کے لیے ضائع نہ کرو‘ بلکہ ان لمحات کو خوب انجوائے کرو اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُرلطف بناؤ‘ اس لیے کہ یہ زندگی صرف ایک بار ہے اور پھر اس انجوائے منٹ کا موقع نہیں ملے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے موج اڑانے کے لیے نہیں‘ بلکہ امتحان گاہ میں بھیجا ہے اور اس امتحان کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگائیں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ کب اس کی مہلت ختم ہو جائے۔ یہ ہے وہ امتحان جس میں ہمیں ڈالا گیا اور ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ اسی فکر کا نام فکرِ آخرت ہے۔

طالبِ دنیا اور طالبِ آخرت کا تقابل

طالبِ دنیا اور طالبِ آخرت کے تقابل کے حوالے سے بانی محترم اکثر ایک حدیث سنایا کرتے تھے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ، وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ فِي أَحْوَالِ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِي أَيِّ أَوْدِيَتِهٖ هَلَكَ)) (رواه ابن ماجه)

’’جو شخص سب فکروں کو چھوڑ کر ایک فکر اپنا لے گا یعنی آخرت کی فکر تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کی فکریں اپنے ذمہ لے لے گا‘ اور جو شخص طرح طرح کی دنیا کی فکروں میں لگا رہے گا تو اللہ تعالیٰ پرواہ نہ کرے گا وہ چاہے جس مرضی وادی میں ہلاک ہو۔‘‘

اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث ہے جسے بٹر صاحب اکثر اپنے درسِ حدیث میں شامل کرتے ہیں‘ وہ بہت اہم ہے:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ((مَنْ كَانَتِ الْآخِرَةُ هَمَّهٗ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ، وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ، وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهٗ جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهٗ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهٗ، وَلَمْ يَأْتِهٖ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَهٗ)) (رواه رزين)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کر رہے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص

آخرت کو اپنا غم بنا لے (اور اس کے فکر کا مرکز و محور آخرت میں جہنم کے عذاب سے چھٹکارا پانا بن جائے تو) اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غنا پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اس کے زندگی کے سارے کاموں کو سمیٹ دیتے ہیں۔ اور دنیا اس کے پاس ذلیل و رسوا ہو کر آتی ہے۔ اور (اس کے برعکس) جو دنیا کو اپنا غم بنا لے‘ اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان فقر لکھ دیتا ہے اور اس کے دنیا کے کام پھیلا دیتا ہے‘ اور دنیا میں سے اس کے پاس وہی کچھ آتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔‘‘

گویا جو آخرت کو اپنا غم بنائے گا تو اس کی ساری توجہ اُدھر ہو جائے گی اور اس کی دنیا بالکل نظر انداز ہو جائے گی۔ جیسے ہم دنیا کو جب اپنا ہدف بناتے ہیں تو آخرت ہمیں بھولی رہتی ہے اسی طرح آخرت کو جب ہم اپنا ہدف بنائیں گے تو دنیا کو ہم نظر انداز کر دیں گے۔ بہرحال جو شخص بھی دنیا سے صرفِ نظر کرے گا تو سب سے پہلے احساسِ کمتری اس کے دل سے چلا جائے گا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور پھر اللہ تعالیٰ جو دے رہا ہے اس پر وہ راضی اور قانع ہو جائے گا کہ میری بنیادی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں تو یہی میرے لیے بہت ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ غنا کی دولت بڑی اونچی شے ہے اور یہ مال و دولت سے حاصل نہیں ہوتی‘ بلکہ جتنا زیادہ مال و دولت ہے اتنا ہی فقر بڑھتا ہے اور اتنی ہی ہوس بڑھتی ہے۔

آخرت کو اپنی فکر کا محور بنانے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کا مال و متاع اس تک ذلیل ہو کر پہنچتا ہے۔ اب تقابل کیجیے کہ ایک طرف وہ شخص ہے جو ہر وقت دنیا کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس نے دنیا کے مال و متاع کو ہی اپنا مرکز و محور بنایا ہوا ہے‘ لیکن اس کو بھی وہی ملے گا جو اللہ نے اُس کے لیے معین کیا ہوا ہے‘ جبکہ اس کے مقابلے میں ایک وہ ہے جس کے پیشِ نظر دنیا نہیں‘ آخرت ہے اور وہ دنیا کا طالب نہیں ہے تو اس کو بھی ملے گا وہی جو اللہ نے اس کے مقدر میں لکھا ہے‘ لیکن یہ دنیا کا مال و متاع اس تک ذلیل ہو کر پہنچے گا۔

یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں‘ بلکہ یہ حقائق ہیں جو میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک روشن مثال موجود ہے بانیٔ تنظیمؒ کی کہ چالیس سال کی عمر میں انھوں نے اپنے میڈیکل کلینک کی بساط اس مقصد کے لیے لپیٹ دی کہ اللہ اور اس کے دین کے لیے کام کرنا ہے۔ ان کے پاس کوئی دنیوی ذرائع نہیں تھے۔ نو (۹) بچے تھے جو سب کے سب تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کا ہاتھ بٹا رہا ہو‘ بلکہ سب کے سب dependent تھے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کیسے دیا‘ کہاں سے دیا؟ یہ سب

وہی جانتا ہے: ﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ﴾ (الطلاق:۲) ''اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا''۔ بانی محترم انتہائی غیور تھے اور کسی سے کوئی تعاون لینا ان کو انتہائی ناپسند تھا' لیکن انتظام کرنے والا اللہ تھا' تو سارے انتظام بہت عمدگی سے ہوئے اور سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوئے۔ نو (۹) بچوں کی تعلیم بھی ہوئی' ماشاءاللہ سب کی شادیاں بھی کیں اور باقی سارے معاملات بھی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ یہ عملاً ہوا ہے' اسی دور میں ہوا ہے اور ایسی بے شمار مثالیں آپ کے سامنے بھی ہوں گی۔

زیرِنظر حدیث کی روشنی میں ایک طرف تو وہ شخص ہے جو آخرت کو حرزِ جان بنالے اور اس کے برعکس ایک وہ ہے جو دنیا اور دنیوی ضرورتوں کو ہی اپنا سب غم بنالے۔ آج مسلمانوں میں سے بھی ننانوے فیصد کا حال یہی ہے کہ انہیں بس دنیا ہی کی فکر ہے اور وہ اپنے بچوں کو بھی یہی سبق دے رہے ہیں کہ اپنا مستقبل سنوارو —— اور مستقبل یہ ہے کہ دنیا بن جائے۔ سارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا آپ کو یہی بتا رہا ہے کہ اپنے بڑھاپے کا خیال کرو' اپنی زندگی کا خیال رکھو' اپنا پیسہ وہاں لگاؤ جہاں نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پیسے کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو' بلکہ اپنے پاس سنبھال کر رکھو تاکہ بڑھاپے میں کام آئے! ساری دنیا یہ تلقین کر رہی ہے اور اسی کو دانش مندی اور عقلمندی کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا شخص جو دنیا کو ہی اپنا غم بنالے اور اسی کی فکر میں لگا رہے تو اس کا پہلا نقصان اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بتایا: جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهٗ بَيْنَ عَيْنَيْهِ کہ اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان فقر لکھ دیتا ہے اور فقر کا مطلب ہے محتاجی۔ یعنی اسے جتنی دنیا مل رہی ہے وہ اس پر قناعت نہیں کر رہا' بلکہ اس میں اور ہوس کی آگ بڑھ رہی ہے اور وہ اپنے سے نیچے والوں کے بجائے' اوپر والوں کو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان موجود ہے کہ دین کے معاملے میں ان کو دیکھو جو تم سے اوپر ہیں اور دنیا کے معاملے میں ان کو دیکھو جو تم سے نیچے ہیں۔ یہ بڑا بنیادی اصول ہے' جبکہ آج کا اصول یہ ہے کہ دنیا کے معاملات میں اپنے سے اوپر والوں کو دیکھو' اُن سے سبق حاصل کرو۔ اگر وہ وہاں پہنچے ہیں تو تم کیوں نہیں پہنچ سکتے؟ اور پھر جو وہاں پہنچ جاتا ہے وہ ایک دوڑ میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے فقر اور محتاجی لکھ دی جاتی ہے اور پھر انہیں اس مقام تک پہنچ کر بھی تسلی نہیں ہوتی اور آگے سے آگے کی بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

دنیا کو اپنا سب کچھ سمجھ لینے والے کو ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہوس ختم نہیں ہوتی اور محتاجی اس کا مقدر بن جاتی ہے' جبکہ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے: وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهٗ کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے کام اس کے لیے پھیلا دیتے ہیں اور وہ ان کے اندر ہی مرکھپ جاتا ہے۔ ایک مسئلہ ابھی نمٹتا نہیں ہے کہ دوسرا مسئلہ سر اُٹھائے کھڑا ہوتا ہے۔ تیسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: وَلَمْ يَأْتِهٖ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَهٗ کہ جو جتنا چاہے دنیا کا طالب بن جائے لیکن اسے اتنا ہی ملے گا جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا' چاہے وہ جتنی مرضی کوشش اور جِدّوجُہد کر لے۔

فکرِ آخرت ہی کامیابی کی علامت ہے!

فکرِ آخرت کے حوالے سے مولانا روم کا بڑا خوبصورت شعر ہے ؎

جانِ جملہ علم ھا این است این
کہ بدانی من کیم در یومِ دین!

''حقیقی علم کی جان اصل میں یہی ہے کہ انسان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ کل قیامت کے دن میں کہاں ہوں گا اور میرا مقام کیا ہوگا!''

مولانا رومی فرما رہے ہیں کہ علم کی معراج یہ جاننا ہے کہ انسان کل قیامت کے دن کس حال میں ہوگا۔ دوسری طرف آپ کو معلوم ہے کہ آج کل علم کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے' اس سے یہ چیز بالکل خارج ہے' بلکہ اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ آخرت کو بھلا دو' اس کا خیال ہی دل سے نکال دو' ورنہ دنیا کی دوڑ میں آگے نہیں نکل سکتے۔

فکرِ آخرت کے حوالے سے مولانا رومی کے اس شعر کو پڑھتے ہوئے مجھے وہ لطیفہ نما حکایت ذہن میں آتی ہے کہ ایک بڑا دانشور فلسفی کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ دورانِ سفر فلسفی نے وقت گزاری کے لیے بڑی مہارت سے چپّو چلاتے ہوئے ملّاح سے پوچھا کہ تم کشتی تو بڑی مہارت سے چلا رہے ہو' لیکن کبھی تم نے منطق اور فلسفہ بھی پڑھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں جی' مجھے تو یہی نہیں معلوم کہ منطق اور فلسفہ کیا شے ہے۔ اس دانشور نے تبصرہ کیا کہ تمہاری آدھی عمر ضائع گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سمندر میں طغیانی آ گئی اور کشتی ڈولنا شروع ہوگئی' قریب تھا کہ وہ کشتی اُلٹ جاتی۔ اب ملّاح نے فلسفی سے پوچھا کہ تمہیں تیرنا آتا ہے؟ فلسفی نے کہا: نہیں! تو اس پر ملّاح نے کہا کہ پھر تمہاری ساری عمر ضائع ہوگئی۔ اسی کو آگے قیاس کر لیجیے کہ اگر آخرت کا ہمیں

احساس نہیں ہے تو پھر ہمارا تمام تر حاصل کیا گیا علم ضیاع ہے۔ آپ نے پی ایچ ڈی کی پچاس ڈگریاں بھی حاصل کر رکھی ہیں‘ لیکن اگر آخرت کا خیال نہیں ہے تو علم کے اعتبار سے یہ سب صفر کے درجے میں ہے۔

چنانچہ سچے اہلِ ایمان کے جو اوصاف قرآن نے بیان کیے ہیں‘ اُن میں بھی فکرِ آخرت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمنون میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝۶۰﴾

’’اور وہ جو دیتے ہیں (اللہ کی راہ میں) تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔‘‘

نیکی کے کام کر رہے ہیں‘ لیکن دل لرزتا رہتا ہے کہ انہیں اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے‘ آخرت میں اللہ کی عدالت میں پہنچنا ہے۔ یہ ہے فکرِ آخرت!

اسی طرح آخرت میں اہلِ جنت کا ایک مکالمہ ہوگا —— سورۃ الطّور میں اس کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ایک خاص قسم کی سٹیج لگی ہوگی جس پر اہلِ جنت اکٹھے بیٹھے آپس میں خوش گپیاں کر رہے ہوں گے اور خوش طبعی ہو رہی ہوگی۔ اسی دوران وہ ایک سوال آپس میں کریں گے کہ تم جنت میں کیسے پہنچ گئے؟ یعنی تمہارا ایسا کون سا خاص عمل تھا جس کی بدولت تم جنت کے بالا خانوں پر براجمان ہو؟ اب ظاہر بات ہے کہ ہر ایک کچھ نہ کچھ تو بیان کرے گا‘ لیکن قرآن نے ان میں سے جو مشترکہ بات (common factor) ہوگی اسے نقل کیا ہے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ’’وہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے اہل وعیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے‘‘۔ یعنی دنیا میں اپنے اہل وعیال اور عزیز واقارب کے درمیان معمول کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں! نہ معلوم نیک اعمال کی قبولیت کے لیے مطلوبہ معیار کا اخلاص ہمارے دلوں میں ہے بھی یا نہیں؟ کہیں ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو ہماری ساری محنت کو ہی اکارت کر دے۔ ایسے اندیشے اور خدشے ہر لمحہ ہمیں دامن گیر رہتے تھے۔ یہ ہے اصل شے جو انسان کو وہاں پر کامیابی تک پہنچائے گی اور اسی کا نام فکرِ آخرت ہے۔

اسی طرح سورۃ النازعات میں تقویٰ کی حقیقت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝۴۰﴾ ’’اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے (کے خیال) سے اور اُس نے روکے رکھا اپنے نفس کو خواہشات سے‘‘۔ یعنی جو

دنیا میں رہتے ہوئی اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور ساری عمر آخرت کا خیال اس پر طاری رہا کہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے اور اس احساس کی وجہ سے اس نے اپنے نفس کے گھوڑے کو لگام دے کر رکھی اور اسے اللہ کے احکامات پر کاربند کیا تو اس کی جزا یہ ہے: ﴿فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۴۱﴾ ’’تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے‘‘۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ۔ آمین!

فکرِ آخرت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رویّہ

اس فکرِ آخرت کا احضار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بھی بہت تھا۔ بطورِ نمونہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک طویل حدیث کا صرف وہ حصہ پیش (quote) کروں گا جس کا تعلق فکرِ آخرت سے ہے۔ یہ حدیث ہمارے منتخب نصاب میں ’’حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ‘‘ کے عنوان سے شامل ہے اور آپ نے بانیٔ محترم سے اس کی تشریح بھی سنی ہوگی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ایک نوجوان اور بہت ہونہار صحابی تھے۔ آنحضور ﷺ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی اور آپؐ اُن پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ایک غزوہ سے واپسی پر آنحضور ﷺ کی اونٹنی بقیہ لشکر سے ذرا الگ ہوگئی تو حضرت معاذؓ آنحضور ﷺ کے ساتھ لگے رہے‘ اس خیال سے کہ کہیں کوئی دشمن حملہ آور نہ ہو جائے۔ وقت بھی ایسا تھا کہ لوگ اونگھ رہے تھے۔ آنحضور ﷺ نے دیکھا تو آپؐ نے حضرت معاذ کو آواز دے کر اپنے اور قریب کر لیا۔ جب حضرت معاذ نے دیکھا کہ اس وقت آنحضور ﷺ مجھ سے خوش ہیں اور موقع بھی تنہائی کا ہے تو آپؓ نے ہمت کر کے آنحضور ﷺ سے کہا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِيْ اَسْأَلُكَ عَنْ كَلِمَةٍ قَدْ اَمْرَضَتْنِيْ وَاَسْقَمَتْنِيْ وَاَحْزَنَتْنِيْ ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات پوچھوں جس نے مجھے مریض بنا کر رکھ دیا ہے کہ میں اس کی فکر کے اندر گھلا جا رہا ہوں اور اس نے مجھے بیمار کر دیا ہے اور مجھے شدید فکر اور غم سے دوچار کر دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: پوچھو جو چاہو! تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھا: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيَ الْجَنَّةَ لَا اَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ غَيْرَهَا ’’اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے وہ عمل بتا دیجیے‘ جو مجھے جنت میں داخل کر دے‘ اس کے سوا اور کوئی بات مجھے آپ سے نہیں پوچھنی‘‘۔ یہ ہے ایک صحابیؓ کا سوال جو ہر وقت آنحضور ﷺ کے دست و بازو کی حیثیت سے آپ ﷺ کے ساتھ ہیں‘ غزوے سے واپس آ رہے ہیں‘ لیکن فکرِ آخرت اس

درجے دامن گیر ہے کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے اس مسئلے نے اتنا پریشان کیا ہوا ہے کہ بیمار بنا دیا ہے اور شدید فکر و غم میں مبتلا کر دیا ہے۔

یہ ہے فکرِ آخرت اور قرآن اسی کی طرف ہماری توجہ بار بار دلا رہا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ﴾ (الحشر:۱۸) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!'' ظاہر ہے یہ اُس کل کی بات ہے جو بعث بعد الموت کے بعد آنے والا ہے' جس دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اس دن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر صاحبِ ایمان اپنی زندگی اللہ کے تقویٰ کے سائے میں گزارنے کا اہتمام کرے اور اپنے اعمال کا مسلسل جائزہ لیتا رہے کہ اُس نے آخرت کے حوالے سے اب تک کیا کمائی کی ہے اور کائناتی حکومت کے امپیریل بینک میں اپنے کل کے لیے اب تک کتنا سرمایہ جمع کرایا ہے۔

دنیا کی حقیقت اور فکرِ آخرت

قرآن حکیم کی متعدد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس حوالے سے قرآن مجید کا اصل پیغام ہی فکرِ آخرت ہے اور اللہ کی طرف سے انسانوں سے شکوہ کیا جاتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی تم دنیا کی زندگی کو ہی ترجیح دیتے ہو! اسی طرح بہت سی احادیث میں دنیا کی اصل حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کی اصل حقیقت آنحضور ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ: ((اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ وَطَالِبُهَا کِلَابٌ)) ''دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کُتّے ہیں''۔ کسی حدیث میں دنیا کو مکھی کے پَر سے تشبیہہ دی جا رہی ہے اور کہیں بکری کے مرے ہوئے بچے سے۔ وہ حدیث بہت مشہور ہے کہ ایک بار حضور اکرم ﷺ نے راستے میں کہیں بکری کے مردہ بچے کو دیکھا تو اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم میں سے کون اسے ایک درہم کے عوض خریدے گا؟ ظاہر بات ہے کہ یہ تعلیم کا ایک انداز تھا۔ صحابہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسا احمق کون ہو سکتا ہے جو اس کے لیے ایک درہم بھی ضائع کرے۔ ہم میں سے تو کوئی اسے بلا قیمت لینے کو بھی تیار نہیں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی حقیقت اللہ کی نگاہ میں اس سے بھی کمتر ہے۔ یہ ہے دنیا کی اصل حقیقت' لیکن عملاً اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آخرت کو ماننے والے بھی دنیا کو ہی ترجیح دے رہے ہیں اور فکرِ آخرت اس وقت انتہائی ناپید ہے۔

فکرِ آخرت کے حوالے سے ایک اور بات نوٹ کیجیے کہ اللہ کے دین کے غلبے کی جِدّوجُہد

بھی اگر فکرِ آخرت اور اس کے لازمی تقاضوں سے بے گانہ ہو کر کی گئی تو یہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہاں بھی ترجیح فکرِ آخرت کو ہونی چاہیے۔ محض دنیا میں غلبہ اگر ہمارا منتہائے مقصود بن گیا کہ دین کو غالب کرنا ہے اور فکرِ آخرت اس میں سے غائب ہو جائے تو یہ بھی پٹڑی سے اترنے کا باعث بن سکتا ہے۔ فکرِ آخرت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ جدوجہد اس طور سے کی جائے جو اللہ کو پسند ہے اور ان اصولوں کے مطابق کی جائے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے طے کر دیے ہیں اور پھر اس جدوجہد کا اصل مقصد اپنی اُخروی نجات اور رضائے الٰہی کا حصول ہو' تب یہ معاملہ صحیح طور پر آگے بڑھے گا۔ اگر یہ سب بنیاد میں نہیں ہے تو غلبہ اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ڈی ٹریک ہو جائے گی۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی

اس ضمن میں' میں اپنا احساس آپ کے سامنے بیان کرنا چاہ رہا ہوں کہ آج جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بات ہو رہی ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ مادی ترقی اتنی ہو چکی ہے کہ نگاہیں چکا چوند ہو رہی ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک انتہائی مصنوعی فضا میں جی رہے ہیں۔ حقائق ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہیں اور ایک جعلی (fabricated) ماحول پوری دنیا پر چھا چکا ہے' جو حقیقت سے اتنا ہی دور ہے جتنا ہماری زمین سے ساتواں آسمان دور ہے۔ دنیا کی اصل حقیقت تو وہ ہے جو آنحضور ﷺ بتا رہے ہیں' جبکہ اس وقت دنیا کی چمک دمک نظر کو خیرہ کر رہی ہے۔ اقبال نے اسے Glittering exterior of the Western civilization قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

یعنی یہ سارے کا سارا دھوکا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن بھی بار بار کہتا ہے کہ یہ دنیا متاعِ غرور ہے: ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾﴾ (الحدید) ''اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ نہیں ہے''۔ یہاں کی چمک دمک انسان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور یہ چمک دمک بھی اب اپنے عروج پر ہے کہ اب حقیقت تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے اور اس تک ہمارا خیال جانا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔

دنیا کی تشکیل اللہ نے ایسی رکھی ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے مختلف ترغیبات ہیں اور

وہ ان کی طلب میں کائنات کے اصل حقائق سے غافل ہو جاتا ہے۔ دنیا کے اس کُرّۂ ارض پر قدم رکھنے والا پہلا انسان (حضرت آدم علیہ السلام) اصل حقیقت سے غافل نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ دنیا ہی دارالامتحان ہے جس میں کامیابی کے لیے بہرحال محنت کرنی پڑتی ہے‘ ذہن وفکر کو استعمال کرنا پڑتا ہے‘ لیکن آج صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دنیا کو آزمائش کے لیے بنایا تھا‘ لہٰذا اس میں دلچسپیوں کا سامان بھی بہت کچھ ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

دنیا کی یہ چمک دمک سائنسی ترقی اور شیطانی تہذیب کے نتیجے میں ہزار گنا بڑھ چکی ہے۔ یہی ہے وہ چیز جس نے موجودہ دنیا کو دجالی تہذیب اور دجالی دَور بنا کر رکھ دیا ہے۔ اصل حقیقت سے ہم بالکل غافل ہیں اور خیرہ کرنے والی چمک دمک نے ہمیں حقائق سے محروم کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان کو دھوکے میں ڈالنے والی دو چیزیں ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳﴾

’’اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ ہی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آ سکے گا۔ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے‘ تو (دیکھو!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے دُنیا کی زندگی۔ اور (دیکھنا!) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اللہ کے حوالے سے وہ بڑا دھوکے باز۔‘‘

یعنی اصل حقائق سے دُور کر کے ایک مصنوعی فضا میں لانے کے لیے دو چیزیں ہیں‘ ایک ہے دنیا کی چمک دمک اور دوسرا ہے شیطان جو انسان کو ورغلاتا ہے اور اسے اللہ کی شانِ رحیمی کے حوالے سے بھی دھوکہ دیتا ہے۔ اس کا تو مشن ہی نوعِ انسانی سے انتقام لینا ہے اور اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے ساتھ جہنم میں جائیں۔

دَجّالی تہذیب میں فکرِ آخرت کی اضافی اہمیت

یاد رکھیے کہ آج دنیا کی چمک دمک پہلے کے مقابلے میں سینکڑوں گنا زیادہ ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے‘ اس لیے کہ یہ سب آپ کے علم میں ہے۔ دوسری طرف شیطان کی

قوت بھی کئی ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ میں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کروں گا۔ شیطان کو اللہ نے یہ اختیار نہیں دیا تھا کہ کسی انسان کو جو صراطِ مستقیم پر چل رہا ہو‘ زبردستی وہاں سے کھینچ کر گمراہی پر ڈال دے۔ شیطان کا اختیار بس اتنا ہے کہ وسوسہ اندازی کرنا اور سبز باغ دکھا کر انسان کو پٹڑی سے اتارنے کی کوشش کرنا۔ اس سے زیادہ کا اسے کوئی اختیار نہیں ہے‘ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ آج کے انسان نے شیطان کے مشن کو خود سنبھال لیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا جو گٹھ جوڑ بنا ہوا ہے‘ یہ اس وقت شیطان کے سب سے بڑے ایجنٹ ہیں اور یہ شیطان کے ایجنڈے کو مکمل کرنے کے لیے اپنی پوری مادی قوت کو استعمال کر رہے ہیں۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا کہ ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا!
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

ابلیس کو اب یہ سہارا (support) جو مل گیا ہے تو وہ قوت سے اہلِ ایمان کو صراطِ مستقیم سے کھینچ کر اُتار رہا ہے‘ اور ہم میں سے جو زیادہ حق پر چلنا چاہتا ہے اسے زبردستی اور پوری قوت سے کھینچا جا رہا ہے۔ آج ہم اس فضا میں ہیں جس کا نام ہی دجالی تہذیب ہے۔ شیطان کو آج جیسی کامیابی حاصل ہے‘ پوری تاریخ انسانی اور پوری تاریخ شیطانی میں کبھی نہیں ملی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان حقائق سے کوسوں دور ہے اور انتہائی مصنوعی اور ملمع کاری والی زندگی نے ہمیں اپنے چنگل میں لیا ہوا ہے۔ اس لیے اللہ ربّ العزت نے فرمایا تھا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶﴾ (فاطر) ’’یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے‘ چنانچہ تم بھی اس کو دشمن ہی سمجھو! یہ تو بلاتا ہے اپنے ہی گروہ کے لوگوں کو تاکہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں‘‘۔ وہ تو اپنے حمایتیوں کو بھی اسی چیز کی طرف بلا رہا ہے کہ وہ بھی دوزخ والوں میں سے ہو جائیں۔ وہ ساری نوعِ انسانی کو اپنے ساتھ دوزخ میں لے جانا چاہتا ہے۔ آج ساری دنیا شیطان کی وفادار اور اس کی دوست بن چکی ہے اور اللہ کی بغاوت پر اتری ہوئی ہے۔ اس میں کافر اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں ہے‘ الا ماشاء اللہ۔ لہٰذا آج کی اس مصنوعی دنیا میں فکرِ آخرت سب سے مشکل ہے‘ اس لیے کہ ماحول سرے سے سازگار نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کا شعوری اہتمام کرنا ہوگا‘ لہٰذا اس کو معمولی نہ جانیے‘ بلکہ یہی اصل

کام ہے جو ہم نے کرنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں آخرت کی صحیح فکر عطا فرمائے جو ہمارے عمل کو اس راہ پر ڈال دے جو اللہ کو مطلوب ہے اور ہم وہ سب کچھ عملاً کریں جو رب کو پسند ہے اور ہم صحیح معنوں میں آخرت کو اور دین کو دنیا کے تمام کاموں پر ترجیح دینے والے اور مقدم رکھنے والے بن جائیں۔ آمین یاربّ العالمین۔

تنظیمی زندگی میں فکرِ آخرت کا تقاضا

تنظیمی زندگی میں فکرِ آخرت کا تقاضا کیا ہونا چاہیے' ابھی بہت خوبصورت انداز میں اور ہر زاویے سے برادرم شجاع الدین شیخ نے آپ پر واضح کیا' لہٰذا مجھے اس میں کچھ مزید اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چند ایک باتیں ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فکرِ آخرت ہی اصل میں ہمارے قبلے کو درست رکھنے والی چیز ہے اور یہ ہمیں اپنے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دینے کی موجب بنے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم تنظیم میں شامل کیوں ہوئے؟ ہم اقامتِ دین کی جدّوجُہد کیوں کر رہے ہیں اور ہمارا اصل ہدف کیا ہے؟ یہ سب باتیں قراردادِ تاسیس سے بڑی واضح ہو چکی ہیں کہ ہمارا اصل ہدف اپنے رب کو راضی کر کے اپنی آخرت سنوارنا ہے۔ ایک قریبی ہدف بھی ہے کہ ہم دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کر لیں' لیکن اس پر ہمیں مکلّف نہیں ٹھہرایا گیا کہ بالفعل ہی قائم کر دو! اس کے لیے جدوجہد کرو اور صحیح خطوط پر کرو' یہ اصل ہدفِ دنیوی ہے' لیکن اگر ہم غلط خطوط پر سعی و جُہد کر کے اللہ کو ناراض کر لیں گے تو پھر ہماری ساری محنت اکارت جائے گی۔ لہٰذا اصل ہدف رب کو راضی کر کے اپنی آخرت کو سنوارنا ہے۔ اور اگر رب کی رضا اور فکرِ آخرت کا حصول ہماری سوچ کا حصہ بن جائے تو اس کا منطقی نتیجہ دنیوی اور لازمی طور پر اُخروی کامیابی کے طور پر نکلے گا۔

اس پس منظر میں ہمیں چاہیے کہ ہم شعوری طور پر عہد کریں کہ دین اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں گے۔ ہماری ترجیح دنیا نہیں ہے' بلکہ آخرت کی کامیابی ہے اور اللہ کی رضا ہی ہمارا اصل ہدف اور اولین ترجیح ہے۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد اور اس کے تقاضوں کو دُنیا کے تمام کاموں پر ترجیح دیں' یعنی عملاً تنظیم کے ہر پروگرام اور نظم کے تقاضوں کو دنیا کے تمام کاموں پر ترجیح دیں۔ اگر ہم نے سنجیدگی اور شعوری طور پر اس کام کو لیا ہے اور آخرت ہی کو اپنی منزل جانا ہے تو یہ اس کا لازمی اور منطقی تقاضا ہے۔ لہٰذا غلبہ و اقامتِ دین اور اللہ کی دھرتی پر اللہ کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد سے متعلق جتنے بھی کام ہیں اُن سب کو ترجیح دیں' چاہے وہ اُسرے

کی میٹنگ ہے' چاہے دعوتی پروگرام ہے' چاہے درسِ قرآن کا پروگرام ہے۔ جو بھی پروگرام تنظیم دے رہی ہے اسے دنیا کے سارے کاموں پر ترجیح دینی ہے۔ اس کا آپ لوگ عہد کریں' ورنہ خدانخواستہ ہم بھی ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰﴾ (القیامۃ) ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو'' کا مصداق بن جائیں گے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

آج کا جہاد

آپ کو معلوم ہے کہ دعوت و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں ہر مرحلے پر جہاد کی مختلف صورتیں اور منازل ہیں۔ آج کا جہاد تزکیۂ نفس اور دعوت کا کام ہے۔ ہم اس قرآنی پکار: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ (الحج:۷۸) ''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اُس کے لیے جہاد کا حق ہے'' پر لبیک کہہ کر تنظیم میں شامل ہوئے ہیں۔ ہمارے عہد نامۂ رفاقت میں بھی یہ الفاظ شامل ہیں: وَاُجَاهِدَ فِي سَبِيْلِهٖ جُهْدَ اِسْتِطَاعَتِيْ (اور اس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا) —— آج کا جہاد کیا ہے؟ سب سے پہلے تو اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اُس کو اللہ کے احکام کا تابع کرنا ہے۔ (اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ) —— پھر یہ کہ نظم کی پابندی اور دعوت کا کام۔ مثبت طور پر (positively) ہمیں جو کام آگے بڑھ کر کرنا ہے وہ دعوت کا ہے۔ یہ مرحلۂ دعوت ہے اور اگر ہم دعوت کا کام ہی نہیں کر رہے تو پھر ہم کام ہی نہیں کر رہے۔ یہ اس مرحلے کا تقاضا ہے' جو پورا کیے بغیر ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہم جہاد فی سبیل اللہ میں ہیں۔ اگر ہم یہ کام کریں تو یقیناً جہاد فی سبیل اللہ میں ہیں اور آج تک کی جو ہماری محنت ہے' یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اسی سے پھر وہ آخری مرحلہ بھی' ان شاء اللہ' آئے گا جس سے شہادت کی موت کے امکانات بنیں گے' جو ایک مسلمان کے دل کی آرزو ہونی چاہیے —— لیکن مکی دور میں ''جہاد بالقرآن'' کو ''جہادِ کبیر'' قرار دیا گیا تھا: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ (الفرقان) ''اور (اے نبی ﷺ!) ان کے ساتھ اس (قرآن) کے ذریعے سے جہاد کیجیے بہت بڑا جہاد''۔ چنانچہ اس مرحلے میں ہمیں دعوت کا کام ترجیح اول سمجھ کر کرنا ہے اور اس کے اندر اپنا مال بھی خرچ کرنا ہے۔ نفس کے خلاف جہاد کے ضمن میں ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶) ''بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے'' کے قرآنی الفاظ آپ بار بار سن چکے ہیں۔

ناظمہ عُلیا کا پیغام: رفقاء کے نام

میرے پاس والدہ محترمہ کا ایک پیغام ہے جو میں آپ کو ضرور سنانا چاہوں گا۔ وہ تنظیم اسلامی کے حلقۂ خواتین کی ناظمہ عُلیا بھی ہیں اور بہرحال میری والدہ ہیں اور رحمت کا یہ سایہ اللہ نے ہم پر قائم رکھا ہے۔ انہوں نے اس اجتماع کے حوالے سے آپ کے لیے یہ پیغام بھیجا ہے جو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا ہوں:

محترم رفقائے تنظیم اسلامی ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہر رفیق راعی ہے اور اپنے گھر والوں کی تربیت کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا گھریلو اُسرے کا قیام لازمی بنائیں۔ بچوں کی نمازوں بالخصوص باجماعت نمازوں پر خصوصی توجہ دیں۔ بچوں کی اخلاقیات پر کڑی نظر رکھیں۔ موبائلز اور انٹرنیٹ وغیرہ کے استعمال میں فری ہینڈ نہ دیں اور ان چیزوں کے ''مثبت'' استعمال کو یقینی بنائیں۔ اذان اور نماز کے اوقات میں موبائلز بند کروا دیں۔ موبائلز کے بے تحاشا استعمال کی وجہ سے دلوں میں دوریاں آ رہی ہیں' گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر والوں سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ دلجمعی سے بیوی بچوں اور گھریلو معاملات میں دلچسپی نہیں ہوتی جو کہ نتیجتاً نقصان دہ ہوگی۔ سوچنے کا مقام ہے ہمارے اکثر رفقاء کے گھروں میں اندر اور باہر کے پردے میں لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ خدا کے لیے ادھر توجہ ضرور دیں۔ غض بصر کے معاملے میں غیر محتاط رویہ نہ اپنائیں۔ اپنے اصل ''ہدف'' اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کو مدنظر رکھیں تو سارے کام آسان ہو جائیں گے۔

بانی محترمؒ اور ان کے گھر والوں کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے اور یہ اجتماعات آپ سب کے ایمان وعمل اور اخلاص میں اضافے کا سبب بنے۔

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

والسلام

آپ سب کے لیے دعا گو

ناظمہ عُلیا' اہلیہ محترمہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ

اختتامی کلمات

آخر میں' میں اللہ کا شکر ادا کروں گا اور ہمیں اس بات پر بھی اللہ کا خصوصی شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ اس نے ہمیں وہ دینی فکر عطا کی ہے جو جامع بھی ہے اور متوازن بھی' لیکن یہاں پر بھی میں ایک وارننگ کے حوالے سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر اس پر ہمیں عُجب ہو گیا تو پھر سب کچھ اکارت جائے گا۔ اس عُجب کا ظہور یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کے کاموں کو کمتر سمجھتے ہیں' انہیں بنظرِ حقارت دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کے اوپر ایسے جملے کسنا شروع کر دیتے ہیں جو شاید ہمارے سارے اعمال کے ضیاع اور بربادی کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بہت خطرناک شے ہے' لہٰذا اس سے ہمیں محتاط رہنا ہوگا اور اس کے لیے کثرتِ استغفار کو اپنا شعار بھی بنانا چاہیے۔

آخر میں' میں آپ سب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر تو شکر اللہ کے لیے ہے اور ہدیہ تشکر کے طور پر میں آپ سب سے بھی گزارش کروں گا کہ ہر شخص یہاں سے فارغ ہو کر اولین فرصت میں دو رکعت شکرانے کے ضرور ادا کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا کی ہے کہ ہم یہاں اکٹھے ہوئے۔ پھر تمام رفقاء واحباب' جو یہاں تشریف لائے' میں اُن کا اپنی طرف سے بھی اور اپنے مرکزی ساتھیوں کی طرف سے بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں' بالخصوص وہ رفقاء جن کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے کہ انھوں نے میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دیے ہیں۔ وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم سے نوازے۔ پھر میں اپنی مرکزی ٹیم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کا محبت بھرا تعاون اور راہنمائی ہر لمحہ مجھے میسر رہی ہے' خاص طور پر ہمارے وہ ساتھی جنھوں نے انتظامیہ کے ساتھ پنجہ آزمائی اور عدالتی کارروائی کے حوالے سے ہماری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر عظیم سے نوازے اور جزائے خیر عطا کرے۔

آخر میں ایک التجا ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں سب سے بڑھ کر یاد رکھیں' اس لیے کہ جس پر جتنی بڑی ذمہ داری ہے وہ اتنا ہی دعاؤں کا محتاج ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ حقدار بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی کی آخری سانس تک ہدایت پر قائم رکھے اور اقامت دین کی جدوجہد کے تقاضوں کو صحیح انداز میں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور شہادت کی موت نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

اصلاحِ معاشرہ کا قرآنی تصور (۲)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

انسانی جذبات کی دوسری نوعیت: جذبۂ خوف

میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے بنیادی جذبات دو نوعیتوں کے ہوتے ہیں‘ ایک مثبت جذبہ ہے‘ یعنی محبت کا جذبہ‘ اور دوسرا منفی جذبہ ہے‘ اور وہ خوف کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے‘ بلکہ ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثر کے بارے میں تو یہ محاورہ راست آتا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اور ع ’’نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی‘‘ کے مصداق ہر کس و ناکس میں ذوقِ نغمہ نہیں ہوتا‘ چنانچہ تلخ نوائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خشونت کی‘ دھمکی کی‘ وعید کی‘ ڈر اور خوف کی بھی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اسی سطح پر ہوتی ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ کسی معاشرے کے رُخ کو متعین کرنے والی تو وہ اقلیت ہوتی ہے جو محبت کی رمز آشنا ہو اور اسی محبت کے مثبت جذبے سے سرشار ہو کر عمل کے میدان میں آئے۔ معاشرے کا رُخ یہی لوگ متعین کرتے ہیں‘ لیکن عوام کی عظیم اکثریت کے لیے دوسرے منفی محرک کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے خوف کا جذبہ۔

اب دیکھنا چاہیے کہ دنیا میں انسانی ذہن کے بنائے ہوئے رائج الوقت نظام ہائے فکر و عمل میں اس خوف کے جذبے کو کس طرح بروئے کار لایا گیا ہے! یہ نظام ہم سب کے سامنے ہیں۔ یہ تعزیرات اور قوانین‘ جواب دہی اور محاسبہ‘ مقدمہ اور تفتیش‘ پولیس اور عدالت‘ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں‘ جیل اور پھانسی‘ یہ سب کچھ اسی خوف کے جذبے کے لیے تادیب و تعزیر اور احتساب کے نظام کے مظاہر ہیں اور یہ پورا نظام اسی خوف کے منفی جذبے کو زندہ و تازہ رکھنے کے لیے ہے۔ جو لوگ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر برائی اور غلط کام سے نہ رُک پائیں‘ ان کو غلط کاری سے باز رکھنے کے لیے خوف کے طور پر سزا کا یہ نظام موجود ہے۔

اسلام کا تعزیراتی نظام اور اس کے اصول

اسلام نے اس کو بھی اختیار اور employ کیا ہے اور بڑی شدت سے کیا ہے‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح اس کو استعمال کیا ہے‘ موجودہ دنیا اس کو اس طرح استعمال کر بھی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ متمدن ترین ممالک میں جرائم کا معاملہ کنٹرول میں نہیں آ رہا اور بڑے دہشت ناک اور سنگین نوعیت کے جرائم کا ارتکاب یورپ بالخصوص امریکہ میں عام ہو رہا ہے اور ان میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرائم کے لیے اسلام نے جو حدود و تعزیرات اور سزاؤں کے ضوابط رکھے ہیں وہ بڑے شدید ہیں۔[1] چنانچہ جو لوگ اسلامی سزاؤں میں شدت کے اصل و اساسی فلسفہ اور حکمت کو سمجھ نہیں پاتے وہ ان کو وحشیانہ و بہیمانہ سزائیں قرار دے دیتے ہیں۔ اسلام میں سزاؤں میں شدت فاطر فطرت نے دراصل عبرت پذیری کے لیے رکھی ہے‘ لہٰذا ان کو درحقیقت عبرتناک سزائیں کہنا صحیح ہوگا۔ اور اس کی اصل حکمت یہی ہے کہ لوگ عبرت پکڑیں اور جرائم سے باز رہیں۔ ساتھ ہی اسلام چونکہ عادلانہ نظام کا عَلَم بردار ہے لہٰذا اس میں شک کا فائدہ ملزم کو پہنچتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ لفظ مُلزِم نہیں‘ ملزَم ہے۔ یعنی وہ شخص جس پر الزام لگایا گیا ہو۔)

اس پس منظر میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس نے دُنیا کو اس اصول سے متعارف کرایا کہ شک کا فائدہ ملزَم کو ملے گا۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم تو اس حد تک ہے کہ ’’شک کا فائدہ اُٹھا کر اگر سو مجرم چھوٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے‘ لیکن کسی بے گناہ کو سزا نہ ہو جائے‘‘۔ موجودہ دُنیا میں ملزَم کو شک کا فائدہ دینے کا جو اصول رائج ہے یہ درحقیقت ابتداءً رحمۃ للعالمین ﷺ ہی کا عطا کردہ (initiated) ہے۔ پھر یہ اصول بھی حضور ﷺ ہی کا دیا ہوا ہے کہ جب تک دونوں فریقوں کی بات نہ سن لو‘ فیصلہ نہ کرو۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں کو سنا جائے اور ثبوت یا تردید اور صفائی کا فریقین کو پورا موقع دیا جائے۔ یہ اصول کس نے مرحمت کیا کہ بارِ ثبوت مدعی پر ہے‘ مدعا علیہ پر نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ ’’یہ چیز‘‘ میری ہے تو مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ جس چیز کی ملکیت کا دعویٰ ہے فی الحقیقت وہ میری ہے۔ جس شخص کے قبضے میں میری کوئی چیز ہے اس سے یہ نہیں

(۱) یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب جہاں اسلامی شریعت کی حدود و تعزیرات جاری ہیں‘ وہاں جرائم کا تناسب دنیا کے تمام ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

کہا جائے گا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ چیز اس کی ہے۔ اگر مدعی ایسا ثبوت یا معتبر شہادت پیش کرنے سے قاصر ہو تو زیادہ سے زیادہ مدعا علیہ سے قسم لے کر مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ آں جنابؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی جو ایک یہودی کے قبضے میں پائی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاضی شُریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ قاضی نے ثبوت طلب کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت میں اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام قنبر کو پیش کیا۔ لیکن قاضی شریح نے اس بنیاد پر مقدمہ خارج کر دیا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی اور آقا کے حق میں غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔ حالانکہ ذاتی طور پر وہ جانتے تھے کہ خلیفۂ وقت‘ دامادِ نبی اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اور گواہ بھی جھوٹ نہیں بول رہے۔ لیکن انصاف کے لیے جو شرائط ہیں ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پورا نہ کر سکے۔ یہ عادلانہ بات دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔

حدود و تعزیرات کی حکمت: عبرت پذیری اور سبق آموزی

یہ سارے اصول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ ہیں۔ لیکن جب مُلزَم پر ان ساری رعایتوں کے باوصف جرم ثابت ہو جائے تو اب اس کو سزا انتہائی شدید ملنی چاہیے تاکہ ایک کو سزا ملے اور لاکھوں افراد تھرا اُٹھیں اور ان کو عبرت حاصل ہو۔ قرآن مجید میں تو یہ فلسفہ قتال کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ الانفال میں فرمایا: ﴿فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۵۷﴾ ’’پس اگر آپؐ ان (معاہدہ توڑنے والے کفار) کو جنگ میں پا جائیں تو ان کی ایسی خبر لیں کہ جو ان کے پیچھے ہیں (معاہدہ توڑنے اور جنگ کی ترغیب دینے والے) ان کو بھی خوف زدہ کر دیں‘ تاکہ وہ عبرت حاصل کریں‘‘۔ ہوتا یہ تھا کہ دعوتِ اسلامی کو کچلنے کے لیے عوام الناس کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے بڑے بڑے سرداران اور چودھری پیچھے بیٹھے سازشیں کیا کرتے تھے‘ جن میں یہودیوں کے سردار پیش پیش رہتے تھے‘ بلکہ اصل سازشی لوگ یہی تھے۔ دوسروں کی حیثیت تو اکثر کٹھ پتلیوں کی ہوتی تھی۔ یہود ہی ان کو ورغلاتے اور حملہ کے لیے بلاتے تھے‘ کیونکہ وہ خود تو حب دنیا کی وجہ سے انتہائی بزدل ہو چکے تھے اور کھلے میدان میں نکل کر مردانہ وار جنگ کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس بزدلی پر قرآن مجید میں بایں الفاظ تبصرہ کیا گیا ہے: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (الحشر:۱۴) ’’(اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر

(کھلے میدان میں) تم سے جنگ نہیں کریں گے‘ لڑیں گے بھی تو قلعہ بند گڑھیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر (پتھراؤ کی صورت میں)‘‘۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ اے مسلمانو! جو کفار حملہ آور ہو کر جنگ کے لیے آتے ہیں ان کی ایسی سرکوبی کرو اور درگت بناؤ کہ ان کے پیچھے بیٹھے جو لوگ سازشیں کرتے رہتے ہیں ان کے بھی ہوش ٹھکانے آ جائیں اور ان کو سبق مل جائے۔ تو جنگ کا معاملہ بھی یہی ہے اور حدود و تعزیرات اور سزا کا معاملہ بھی یہی ہے‘ خواہ دنیا ان کو بڑی ہی وحشیانہ سزائیں کہہ لے۔

بلاشبہ اسلام کی حدود شدید ترین ہیں‘ اس لیے کہ ان کی حکمت عبرت پذیری اور سبق آموزی ہے۔ پھر یہ اصول بھی رکھا گیا ہے کہ ان حدود کو برسرِ عام نافذ کیا جائے‘ کیونکہ پائیدار عبرت اسی طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا رجم (سنگ ساری کے ذریعے ہلاک کرنا) حد[۲] ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا حکم قرآن میں ہے یا نہیں‘ کوئی بھی انصاف پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے حد قرار دیا ہے اور اپنے دورِ سعید میں اس حد کو جاری فرمایا ہے۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد زرّیں میں بھی یہ حد جاری ہوئی ہے۔ تمام ائمہ و فقہاءِ امت کا اس پر اجماع ہے کہ رجم حد ہے‘ اس میں کمی بیشی ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ’تعزیرات‘ وہ سزائیں ہیں جن میں حالات کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ گویا تعزیرات کا معاملہ ایک اسلامی مملکت میں مقنّنہ (legislature) کا میدانِ کار بھی ہے۔ یعنی قرآن و سنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان جرائم کے علاوہ جو ’’حدود‘‘ کے دائرے کے اندر ہیں‘ مقنّنہ تعزیرات مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن ’حدود‘ میں کمی بیشی کا کوئی مجاز نہیں ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا رجم ’حد‘ ہے۔ سرقہ کی سزا قطع ید ’حد‘ ہے۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کے ارتکاب پر سو سو کوڑے کی سزا ’حد‘ ہے۔ قذف کی سزا اسّی (۸۰) کوڑے ’حد‘ ہے۔ مرتد کی سزا قتل ’حد‘ ہے۔ اور حکمت دین یہ ہے کہ ان تمام ’حدود‘ کا نفاذ برسرِ عام ہو‘ تاکہ معاشرہ واقعتاً ان سے عبرت پکڑ سکے اور سبق لے سکے۔

مؤثر ترین خوف: خوفِ آخرت

اسلام نے حدود و تعزیرات کے ذریعے خوف کے منفی جذبے کو پیدا کرنے کا بھرپور اہتمام

(۲) حد جس کی جمع حدود ہے‘ دینی اصطلاح میں وہ سزائیں ہیں جو قرآن و سنت نے مقرر کر دی ہیں۔ (مرتب)

کیا ہے‘ لیکن اسلام انسان کے دل میں جو اصل خوف قائم کرنا چاہتا ہے وہ ’’خوفِ آخرت‘‘ ہے۔ دُنیوی احتساب اور سزا سے بچنے اور اس خوف کے مضمحل ہونے کے تو بہت سے چور دروازے ہیں۔ بدعنوانی اور بے ایمانی (corruption) عام ہوگئی ہے‘ پولیس ہے تو رشوت لینے والی‘ عدالتی نظام ہے تو عدل وانصاف سے عاری۔ پھر اثر ورسوخ اور سفارشات کا وسیع سلسلہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سارے خوف بے اثر ہوگئے۔ اوّل تو جرم میں پکڑے جانا ہی محلِ نظر ہے اور اگر پکڑے بھی گئے تو There is many a slip between the cup and the lip کے مصداق بچ نکلنے کی بہت سی شکلیں ہیں‘ رشوت ہے‘ سفارش ہے‘ جھوٹی شہادتوں کا بندوبست ہے۔ ایک انگریزی نظم کا مصرعہ ہے:

Art, Glory, Freedom fail, but Nature still is fair.

اسی طرح سمجھئے کہ دنیوی خوف سارے ختم ہو سکتے ہیں‘ لیکن آخرت کا حقیقی خوف دل میں ایک مرتبہ واقعی قائم ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ یقین مطلوب ہے کہ ایک آنکھ ہر وقت دیکھنے والی ہے‘ اس سے چھپنا قطعی ناممکن ہے۔ ایک عدالت ہے جہاں نہ کوئی سفارش ہے‘ نہ رشوت ہے‘ نہ فدیہ ہے‘ نہ دوستی کام آنے والی ہے‘ جہاں کوئی ساتھی اور مددگار نہیں ہوگا۔ سورۃ البقرۃ میں یہ بات بنی اسرائیل سے دو مرتبہ تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ فرمائی گئی۔ چھٹے رکوع میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

’’اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا‘ نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی‘ نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔‘‘

پھر آگے پندرہویں رکوع میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

’’اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا‘ نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا‘ نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔‘‘

پھر اسی سورۃ البقرۃ کے چونتیسویں رکوع میں اہلِ ایمان سے خطاب فرما کر اسی بات کا اعادہ کیا گیا‘ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ﴾ (آیت ۲۵۴)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو کچھ مال ومتاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو‘ قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی‘ نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔‘‘

اسی مقصد کے لیے میں نے آغازِ خطاب میں سورۃ العلق کی تین آیات کی تلاوت کی تھی: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ان میں سے پہلی آیت کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ’’ہرگز نہیں! انسان سرکشی پر‘ تعدی پر‘ عدوان پر‘ ظلم پر‘ دست درازی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے‘‘۔ طغٰی ہی سے لفظ طغیان اور طغیانی بنا ہے۔ آخر الذکر لفظ طغیانی اُردو میں کافی مستعمل ہے۔ ع ’’دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام!‘‘ دریا اپنی حد میں ہے تو ٹھیک ہے‘ آگے نکل جائے تو یہی طغیانی ہے۔ انسان اپنے حق پر قانع رہے‘ اپنی حد سے آگے نہ بڑھے تو یہ عدل وانصاف پر مبنی صحیح رویہ ہے۔ لیکن اگر اپنے حق سے تجاوز کر کے کسی دوسرے کے حق پر منہ مارا اور دست درازی کی اور اپنی حد سے تجاوز کر کے کسی دوسرے کی حد میں دخل اندازی کی تو یہ طغیانی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝﴾ ’’ہرگز نہیں! انسان سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہو جاتا ہے‘‘۔ کیوں؟ اس کا سبب اگلی آیت میں بیان ہوتا ہے۔ فرمایا: ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾ ’’اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے‘‘۔ مطلب یہ ہوا کہ برائی اور معصیت پر یہاں پکڑ نہیں ہوتی۔ انسان دیکھتا ہے کہ میں نے جھوٹ بولا تو زبان پر چھالا بھی نہیں پڑا۔ میں نے کسی کو دھوکہ دیا تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے حرام طریقے سے حاصل کیا ہوا مال ہڑپ کیا تو مجھے بدہضمی بھی نہیں ہوئی بلکہ وہ رچ پچ گیا۔ میں نے ناجائز ذرائع سے دولت کمائی‘ خوب رشوت لی اور رشوت دے کر اپنے حق سے زیادہ حاصل کیا‘ کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کیا اور اپنا status بلند کیا‘ لیکن معاشرے میں میری بدنامی ہونا تو درکنار‘ میری شہرت‘ وجاہت اور عزت ووقار میں اضافہ ہی ہوا۔ لوگ مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ دنیا میں اخلاقی برائیوں کی پاداش کا قانون نافذ نہیں ہے۔ طبعی قانون (physical law) بہرحال نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو انسان کو بداخلاقی‘ سرکشی اور جائز حدود سے تجاوز کرنے پر آمادہ کر ہی لیتی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کو اگلی آیت میں بیان فرمایا: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ’’یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا

ہے‘‘۔ یہ یقین اگر انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو طغیانی اور سرکشی کیسے ہو؟ یہ معلوم ہو کہ سب کھایا پیا اُگلنا پڑے گا تو انسان حرام کیسے کھائے گا؟ یہ یقین ہو کہ زندگی کے تمام اعمال کا آخرت میں محاسبہ ہوگا‘ جواب دہی کرنی ہوگی تو انسان بے نیازی کا رویہ کیسے اختیار کرے گا؟

قرآن مجید میں انذارِ آخرت کی مثالیں

یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ ایمان بالآخرت پر قرآن نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں کا مرکز و محور انذارِ آخرت ہے۔ وہی بات کہ ع ’’نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی!‘‘ تاکہ آخرت اور اس کے محاسبے کا خوف انسان کے قلوب و اذہان میں پوری طرح جاگزیں ہو‘ وہاں کی پکڑ کا احساس اور جواب دہی کا استحضار رہے۔ اسی انذارِ آخرت کی کیفیت کا نقشہ مولانا حالی مرحوم نے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

جب نبی اکرم ﷺ نے حکم ربانی ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ کی تعمیل میں اہلِ مکہ کے سامنے وحی الٰہی پیش کی‘ جس میں دعوتِ توحید اور دعوتِ ایمان بالرسالت کے ساتھ انذارِ آخرت پر سب سے زیادہ زور تھا اور اس پر ایمان لانے کی پُرزور اور پُرتاثیر دعوت تھی۔ قیامت‘ میدانِ حشر اور احتساب کے احوال اور شدائد کا بیان انتہائی پُرتاثیر‘ پُرجلال‘ پُرہیبت اور دلوں کو لرزاں و ترساں کرنے والے بلیغ انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ جیسے:

﴿اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱﴾ (القارعۃ)

’’عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار کھائی ہوگی۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ!‘‘

قیامت میں نفسی نفسی کے عالَم کا نقشہ سورۃ المعارج میں بایں الفاظ کھینچا گیا:

﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝۱۷ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝۱۸﴾

’’(وہ عذاب اس روز ہوگا) جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہوگا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو‘ اپنی بیوی کو‘ اپنے بھائی کو‘ اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا‘ اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں! وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی۔ جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی۔ پکار پکار کر اپنے ربّ کی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔‘‘

احوالِ قیامت اور اس کے شدائد و مصائب کے نقشے مختلف اسالیب سے مکی سورتوں میں کھینچے گئے۔ چند مزید سن لیجیے۔ سورۂ عبس کے آخر میں فرمایا:

﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝۳۵ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝۳۶ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝۳۷ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲﴾

’’اُس روز آدمی اپنے بھائی‘ اور اپنی ماں اور اپنے باپ‘ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے۔ ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اُس روز خاک اُڑ رہی ہوگی‘ اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔‘‘

سورۃ القیامہ میں استفہامیہ انداز میں فرمایا: کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی سرکش اونٹ کی طرح بے مہار چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ﴿۳۶﴾﴾ اس سے اس دنیوی زندگی کا حساب نہیں لیا جائے گا؟ اور سورۃ المؤمنون میں فرمایا: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے کار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے؟'' اس کا جواب سورۃ الانفطار میں بایں الفاظ دیا گیا: ﴿وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ﴿۱۱﴾ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور یقیناً تم پر (ہماری طرف سے) نگران مقرر ہیں' معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم لوگ کرتے ہو''۔ اور سورۂ ق میں فرمایا گیا: ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ایک حاضر باش نگران (فرشتہ لکھنے کو تیار رہتا) ہے۔''

سورہ الکہف میں میدانِ حشر کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾

''اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا' اُس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی اور بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا' وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے' اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔''

بعث بعد الموت پر کفار کے اعتراضات

میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں جن سے ایمان بالآخرت کی غیر معمولی اہمیت کا پتا چلتا ہے — لیکن ہوا یہ کہ مکہ میں ان اخبار و احوالِ قیامت و آخرت اور محاسبے سے ایک ہلچل مچ گئی۔ ان کے حاشیہ خیال اور تصور میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی کہ مرنے کے بعد پھر جی اُٹھنا ہے۔ انہوں نے اس کا مختلف انداز میں مذاق اُڑانا شروع کیا اور چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ وہ استفہامی انداز میں اس خبر کا استہزا کیا کرتے تھے۔ ان کی ان مختلف باتوں کا مختلف انداز

میں قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ النمل میں ان کافروں کا قول نقل ہوا:

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۶۸﴾﴾

''اور جن لوگوں نے کفر (کا راستہ) اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا (گل سڑ کر) مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں (قبروں سے) نکالا جائے گا؟ ایسے وعدے تو پہلے سے ہم سے اور ہمارے باپ دادوں سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں (جو نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں)۔''

سورۃ المؤمنون میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ مشرکین و کفارِ مکّہ کا یہ اعتراض نقل ہوا:

﴿قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گی تو کیا ہم (پھر زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے؟'' اسی سورہ میں دہریوں کا بھی قول نقل ہوا۔ یہ وہ بات ہے جو تمام خدا ناآشنا قدیم و جدید فلسفوں میں اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے:

﴿اَیَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۳۷﴾﴾ (المؤمنون)

''کیا یہ (نبی) تم سے یہ وعدہ کرتا (اور تمہیں خبر دیتا) ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور جب تمہاری ہڈیاں بھی گل سڑ کر رہ جائیں گی تو پھر تم کو (قبروں سے) نکالا جائے گا؟ یہ وعدہ بعید ہے بلکہ بعید از قیاس ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس اسی دنیا کی زندگی۔ ہم یہاں خود مرتے ہیں اور خود جیتے ہیں۔ اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

سورۃ الجاثیہ میں ان دہریوں کا قول ایک دوسرے اسلوب سے نقل ہوا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (آیت ۲۴)

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم خود جیتے اور خود مرتے ہیں اور گردشِ ایام کے سوا ہمیں کوئی چیز ہلاک نہیں کرتی۔''

متعدد سورتوں میں آخرت کے بارے میں کفار و مشرکین کی کٹ حجتی کا ذکر کیا گیا ہے۔

چند مثالیں مزید سن لیجیے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٤٩﴾﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد گل سڑ کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم ازسرِنو پیدا کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟'' سورۂ یٰسٓ میں اپنی قدرت کے ساتھ ہی انسان کی حجت بازی کا بھی ذکر فرما دیا: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٧﴾﴾ ''کیا انسان نے (اس بات پر) نظر نہیں کی کہ ہم نے اُس کو نطفے سے پیدا کیا' بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن (کر کھڑا ہو) گیا!''

اعتراضاتِ کفار کے جوابات

قرآن حکیم نے ان تمام اعتراضات کے مختلف اسالیب سے نہایت مدلّل اور جامع جوابات دیے ہیں۔ بطور مثال چند جوابات پیش کیے دیتا ہوں۔ سورۂ یٰسٓ میں وارد اعتراض کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دو کہ ان کو وہی ذات دوبارہ زندہ کرے گی جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا''۔ غور کیجیے کہ کتنی مسکت اور معقول دلیل ہے۔ سورۂ قٓ میں فرمایا: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٥﴾﴾ ''(لوگو! غور کرو) کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز تھے! مگر یہ لوگ دوبارہ کی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں''۔

اسی سورۂ قٓ میں مزید فرمایا:

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾﴾

''اور سنو جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا۔ جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے' وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔ یقیناً ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اُس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔''

سورۃ الانشقاق میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿٦﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ

كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿٧﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿٨﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿٩﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿١٠﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿١١﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿١٣﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿١٤﴾ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿١٥﴾﴾

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' تو اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا' اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اس نے کبھی پلٹنا نہیں۔ پلٹنا کیسے نہ تھا؟ اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا۔''

الغرض جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ابتدائی مکی سورتوں کا مرکز و محور انذار ہے' تاکہ نیند کے ماتے جاگیں' اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ زندگی صرف یہی زندگی نہیں ہے' بلکہ مرنے کے بعد ان کو پھر زندہ کیا جائے گا اور ان کو عدالتِ خداوندی میں محاسبہ کے لیے پیش ہونا ہوگا۔ آخرت کی پیشی' جواب دہی اور جزا و سزا کا اگر انسان کو واقعی دلی یقین حاصل ہو جائے اور اس کے قلوب و اذہان میں راسخ اور جاگزیں ہو جائے تو یہ خوف کا جذبہ دنیا میں اس کو ایک بہترین انسان دوست شخصیت بننے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوگا۔

تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے ناگزیر: حُبِّ الٰہی اور خوفِ آخرت

اسلام انسان کے قلوب و اذہان میں اللہ کی محبت کا مثبت جذبہ اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور اس کی پکڑ کے خوف کا منفی جذبہ پیدا کر کے اس کی ایسی تعمیرِ سیرت و کردار کرتا ہے کہ ایسا انسان ایک طرف نیکی اور بھلائی کا پیکر بن جاتا ہے' دوسری طرف انسان دوستی' انسانی ہمدردی' قوم و وطن کی محبت بھی اس کے وجود میں موجود رہتی ہے۔ چنانچہ یہ نقشہ ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں اور خلافت راشدہ کی حکومت کے دورِ سعید میں بکمال وتمام نظر آتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انسانوں کی اکثریت ع ''نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی'' کے مصداق خوف کے جذبے سے زیادہ محتاط رہتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس جذبے پر نہایت زور دیا ہے اور اسے emphasise کیا ہے۔ سورۃ النّٰزِعٰت میں قیامت و

آخرت کے نقشے کے بارے میں فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾

''پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا۔ جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ چنانچہ جس نے سرکشی کی تھی' اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا' تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔''

جب وہ بڑی آفت یعنی قیامت و آخرت کی گھڑی آئے گی' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ نمایاں کر کے رکھ دی جائے گی تو جس انسان نے دنیا کی زندگی میں سرکشی کی تھی' اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا اور جس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی اور علائق و اسبابِ زندگی کی محبتوں ہی کے پیچھے لگا رہا تھا تو ایسے خود غرض و خود پرست کے لیے دوزخ ہی ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے دل میں اپنے رب' اپنے مالک' اپنے آقا کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی اور محاسبے کا خوف کیا تھا اور نفس کو ضبط میں رکھا تھا' اس کو نفسانی خواہشات سے روکے رکھا تھا تو ایسے شخص کا ٹھکانا جنت ہوگی۔ غور کیجئے کہ یہاں ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾﴾ خوف کے منفی جذبے کو کتنے مؤثر طریق پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں کھڑے ہونے کے خوف سے لرزاں و ترساں رہنا ہی انسان کو ہر برائی اور بدی سے روکنے میں نہایت مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

یہ وہی ''کھڑا ہونا'' ہے جس کی حدیث شریف میں تشریح و تفسیر بایں الفاظ کی گئی ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ))

(رواه الترمذی' عن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ)

یعنی آخرت میں کوئی انسان اللہ کی عدالت کے کٹہرے سے ہل نہ سکے گا جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے: (۱) حساب دو کہ عمر کہاں گنوائی؟ ہم نے تم کو ستر' اسّی (۷۰' ۸۰) برس دیے تھے' وہ کہاں گنوائے؟ (۲) بتاؤ کہ خاص طور پر جوانی کا دور کس حال میں بسر ہوا تھا؟ (۳) یہ بتاؤ کہ مال کہاں سے کمایا تھا' حلال سے یا حرام سے؟ اس کا پورا حساب دو۔ اور (۴) یہ بتاؤ کہ یہ مال خرچ کہاں کیا تھا؟ ادائے حقوق میں یا اللّوں تللّوں میں' اور عیاشی و بدمعاشی میں؟ اس کا بھی پورا حساب دو۔ اور (۵) جو علم تم کو حاصل ہوا تھا اس پر تم نے کتنا عمل کیا تھا؟ اس کا حساب بھی دو۔ ان پانچ باتوں کے حساب کتاب کے بغیر ابنِ آدم کے قدم عدالتِ اُخروی سے جنبش نہ کر سکیں گے۔

فکرِ آخرت کے بارے میں ایک دوسری حدیث بھی سن لیجیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ))

(رواه ابن ماجه' عن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللہ عنہ)

''جو اپنے تمام غموں کو ایک غم بنا لے یعنی اپنی آخرت کا غم تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے غم کے لیے کافی ہو جائے گا۔''

اب ان دونوں احادیث کی روشنی میں متذکرہ بالا آیات پر پھر غور کیجیے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ ''جو شخص اپنے رب کے حضور میں جواب دہی کے احساس و یقین سے لرزاں و ترساں رہا اور اس نے اپنے نفس کی خواہشات کی باگوں کو کھینچ کر رکھا' پس ایسے شخص کا ٹھکانا یقیناً جنت ہوگا''۔ یہ ہے وہ آخرت کے محاسبے کے خوف کا جذبہ۔ ایک مثبت جذبہ محبتِ الٰہی کا اور دوسرا منفی جذبہ آخرت کے خوف کا۔ تعمیر کردار اور سیرت سازی کی یہ دونوں اساسات قرآن نے انسانیت کے لیے فراہم کی ہیں۔ اس کا لب لباب اور حاصل کلام یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے اصل اساس ایمان ہے اور اس کی کامیابی کی اصل راہ تجدید ایمان کی سعی و جہد ہے۔

''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تجدیدِ ایمان کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ تو اس وقت موقع نہیں ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اس موضوع پر ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' میں بھی کئی مقامات کے ذیل میں تفصیل سے بحث ہوتی رہی ہے' اجتماعاتِ جمعہ

اور دوسرے خطابات میں بھی میں اپنی استعداد کے مطابق گاہ بگاہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرتا رہا ہوں۔ میں اس وقت اختصار کے ساتھ ان باتوں کا اعادہ کروں گا تاکہ بات پوری ہو جائے اور ان کی کسی درجے میں تذکیر بھی۔

ایمان کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم (۳) ہے یا اصحابِ یقین کی صحبت ہے‘ یعنی ان لوگوں کی صحبت جن کے اذہان وقلوب میں قرآن حکیم اتر چکا ہو۔ علامہ اقبال کے ان اشعار کے مصداق:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف
جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است — فقر قرآن اصل شاہنشاہی است
فقر قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل نہ دیدن جز بہ ذکر
ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب — کارِ جاں است ایں نہ کارِ کام ولب (۴)

یہ اصحاب یقین آسمان سے نہیں اُترتے اور نہ اُتریں گے۔ یہ وجود میں آئے ہیں‘ اور آئیں گے صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی نازل کردہ کتابِ مبین یعنی قرآن حکیم سے‘ اگر قرآن مجید کا اذہان وقلوب میں ’’نفوذ‘‘ ہو رہا ہو! میں نے یہاں جان بوجھ کر لفظ ’تعلیم‘ یا ’نشر واشاعت‘ کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ لیکن فی الوقت جس چیز کی اصل اہمیت اور ضرورت ہے‘ وہ ہے قرآن حکیم کے اذہان وقلوب میں ’نفوذ‘ کی۔ اگر علمِ قرآن اور اشاعتِ قرآن کا سیلاب بھی آیا ہوا اور وہ سروں کے اوپر اوپر سے جا رہا ہو تو تعمیرِ سیرت و کردار نہیں ہوگی۔ وہی حقیقت کہ ع ’’ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب!‘‘ ضمیر کسے کہتے ہیں؟ باطن میں چھپی ہوئی حقیقت کو۔ اس لفظ کو قلبِ حسّاس اور نفسِ ملامت گر کا ہم معنی

(۳) وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سیپاروں میں
(مولانا ظفر علی خان مرحوم)

(۴) (اشعار کا ترجمہ) قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔ (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق وشوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے۔ یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔ (مرتب)

اور مترادف سمجھئے — تو جب تک انسان کے باطن میں قرآن حکیم سرایت نہ کرے اور قلب میں اس کا نفوذ نہ ہو‘ اسلامی تعلیمات کے مطابق کردار سازی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اس طرح بھی ادا کیا ہے۔ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ کلام الٰہی‘ یہ قرآن حکیم جب کسی کے باطن میں اُتر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے اور اس طرح ایک مکمل طور پر تبدیل شدہ شخصیت وجود میں آ جاتی ہے‘ اور یہی اندر کا انقلاب ہے جو ایک عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

اگر حکومت فی الواقع اور سنجیدگی کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے دو کام کرنے ضروری ہیں‘ جو میں آگے بیان کروں گا۔ یہ احتساب‘ یہ تعزیرات اور یہ قاضی کورٹس‘ یہ اپنی جگہ کسی حد تک ضروری اور مفید ہیں‘ میں ان کی نفی نہیں کر رہا۔ ان چیزوں کے بارے میں تو آغاز ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کی بھی ضرورت ہے اور یہ درمیانے درجے کی اشیاء ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اصلاحِ معاشرہ کے عمل کا ایک سر ہے اور ایک پیر ہے اور ایک درمیانی دھڑ ہے۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف درمیانی دھڑ کی کچھ باتیں ہیں‘ نہ سر کی بات ہے نہ پیر کی۔ اس کا سر (چوٹی) یہ ہے کہ معاشرے میں بحیثیت مجموعی ایک عادلانہ ومنصفانہ نظام قائم ہو۔ پھر تعمیر اخلاق وکردار کے لیے محبتِ الٰہی‘ محبتِ رسول ﷺ اور محبتِ جہاد فی سبیل اللہ کی متحرک (dynamic) مثبت محبتیں افرادِ قوم میں پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے‘ اور اس کا پیر (بنیاد) یہ ہے کہ آخرت کے محاسبے اور جواب دہی اور اُخروی سزا کا منفی جذبہ لوگوں کے اذہان وقلوب میں اُتارا جائے اور hammer کیا جائے۔ ٹھیک ہے کہ دنیوی احتساب کا‘ قانون وتعزیر کا‘ جیل‘ کوڑوں اور پھانسی کا بھی خوف اپنی جگہ رہے‘ اس کی ہرگز نفی نہیں ہے‘ لیکن اصلاً آخرت کا خوف ہی مؤثر ترین خوف ہے۔ اور یہ مثبت اور منفی جذبات لوگوں کے اذہان وقلوب میں سرایت کرانے کا کوئی معقول ومؤثر سلسلہ ہو تو کامیابی ہوگی۔

اصلاحِ معاشرہ کے لیے دو حکومتی اقدامات کی ضرورت

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر اصلاحِ معاشرہ کے لیے حکومت واقعتاً کچھ ٹھوس اور نتیجہ خیز کام کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے دو کام کرنے ضروری ہیں۔ اب میں اس کے بارے میں کچھ

عرض کروں گا۔حکومت کے پاس دو سلسلے ایسے ہیں جن سے یہ کام باحسن وجوہ اور بخوبی سرانجام دیا جا سکتا ہے: پہلا نظامِ تعلیم اور دوسرا ذرائع ابلاغ۔ نظامِ تعلیم کے متعلق یہ بات جان لیجیے کہ جب تک پورے نظامِ تعلیم میں‘ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے نصاب تک‘ قرآن مجید سمویا ہوا نہیں ہوگا کوئی مفید نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوگا۔ محض اسلامیات کا ایک ضمیمہ (Appendix) لگا دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اس کا تجربہ ہمیں پینتیس (۳۵) سال میں خوب ہو گیا ہے☆۔اور ذرائع ابلاغ میں بھی اگر آپ گن کر یہ بتا دیں کہ ہفتے میں ہم نے اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے رکھے ہوئے ہیں تو اس سے ہرگز کوئی بات نہیں بنے گی۔ اصلاح کا عمل اُس وقت تک جاری نہیں ہو سکے گا جب تک قرآن حکیم کا حقیقی فہم لوگوں کے باطن میں سرایت کرنے کی صحیح‘ معقول اور مؤثر منصوبہ بندی نہ کی جائے۔اگر ذرائع ابلاغ انتشارِ فکری‘ اباحیت‘ لذت کوشی اور سرود و تفریح کا باعث بن رہے ہوں اور جملہ پروگراموں میں قوالیوں اور نعتوں کے اوقات جمع کر کے یہ مغالطہ دے دیا جاتا ہو کہ ہمارے ہفتہ وار پروگراموں میں اتنا وقت مذہبی حصے کے لیے مختص ہے‘ تو اس سے کیا حاصل؟ سوال یہ ہے کہ کثرت سے دکھائے جانے والے فواحش پر مبنی پروگراموں کی موجودگی میں ایسے نام نہاد مذہبی پروگراموں کا معاشرے میں کیا واقعتاً کوئی اثر باقی رہے گا؟ ہر سلیم العقل اس کا جواب نفی میں دینے پر مجبور ہے۔

لہٰذا میں عرض کروں گا کہ اس اعتبار سے جائزہ لیجیے‘ جانچیے اور پرکھیے‘ اور دیکھیے کہ کیا حقیقتاً ہمارے ذرائع ابلاغ لوگوں کے اذہان و قلوب میں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت‘ اس کا انقلابی پیغام‘ اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و کردار کے لیے اس کی عطا کردہ محبتِ الٰہی‘ محبتِ رسول اور محبتِ جہاد فی سبیل اللہ کی مثبت جذبے کی اساسات اور خوفِ آخرت اور خوفِ محاسبۂ اُخروی کے منفی جذبے کی بنیادیں قائم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ کام ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے.....لیکن میں انتہائی دُکھ اور رنج کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان دونوں چیزوں یعنی نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی Islamization کا معاملہ تاحال نہ صرف مفقود کے درجے میں ہے‘ بلکہ اخلاق اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے قرآن حکیم کی dynamic اساسات و تعلیمات کو اختیار کرنے کے بجائے یہ دونوں وسائل تخریب کے کام میں مصروف

☆ واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۸۲ء کا ہے‘ جس پر چونتیس (۳۴) سال مزید گزر چکے ہیں۔

ہیں اور ہماری نوجوان نسل سے لے کر عوام الناس تک سب کو خدانا آشنا تہذیب اور اس کی اقدار‘ نیز لذت کوشی‘ دنیا اور مادہ پرستی کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں‘ اور ہمارے عوام و خواص میں‘ اِلا ماشاء اللہ‘ یہ نظریہ پروان چڑھ رہا ہے اور روز بروز نشو ونما پا رہا ہے کہ: ’’بابر بعیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست!‘‘ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ —— ان شاء اللہ العزیز اس موضوع پر آئندہ جمعہ کو بھی گفتگو جاری رہے گی۔

وما توفیقی الا باللہ

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مجلد 400 روپے، غیر مجلد 200 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۱۵)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

۴۶واں اصول:

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾

''تم جو نیکی بھی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے۔''

یہ قرآنی محکم اُصول ہے' اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور بندوں کے ساتھ تعلقات کے باب میں اِس کا گہرا تعلق ہے۔ اس قرآنی محکم اصول کا تذکرہ احکامِ حج کے ضمن میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷﴾ (البقرة)

''حج کے مہینے مقرر ہیں' اس لیے جو شخص اِن میں حج لازم کر لے وہ اپنی بیوی سے میل ملاپ کرنے' گناہ کرنے' اور لڑائی کرنے سے بچتا رہے۔ تم جو نیکی بھی کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو' پس سب سے بہتر توشہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔ اور اے عقلمندو! مجھ ہی سے ڈرتے رہا کرو۔''

اس عظیم اصول سے ایمانی اور تربیتی باتیں مؤمن میں پروان چڑھانا مطلوب ہے' بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کا طلب گار ہو۔ ہم اِن باتوں کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

اوّل: اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کو خالص کرنے کی ترغیب اور حوصلہ افزائی

ہے' بھلے کسی دوسرے کو خبر نہ ہو' بلکہ اللہ کا صاحبِ توفیق بندہ تو وہ ہے جو آخری حد تک اس بات کی پوری کوشش کرے کہ مخلوق کو اس کی نیکی کی خبر نہ ہو جائے۔ اِس بات کے بہت سارے فائدے ہیں' دل اور روح پر اِس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

دوم: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ﴾ (البقرة:۱۹۷) ''تم جو نیکی بھی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے''۔ اس اصول کے روح پر بہت سارے اثرات مرتب ہوتے ہیں' مثلاً: روح کا آرام' دل کا سکون۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ اخلاص کے ساتھ نیکی کرنے والا مخلوق کی طرف سے تعریف یا عزت واحترام کا طلب گار نہیں ہوتا' بلکہ جن لوگوں کے ساتھ اس نے نیکی کی ہو اگر اُن کی طرف سے کوئی تکلیف یا پریشانی آئے تو اُسے صبر کرنا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ نیکی کرتے وقت اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس کے رب کو اس کا اچھی طرح علم ہے اور وہی اس کو بدلہ دے گا۔ اِس طرح لوگوں کی زیادتی اور ناشکری کو برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے' اِس کے مقام کے پہچاننے میں کوتاہی یا زبان سے اس کا شکریہ ادا نہ کرنے پر شکوہ کرنا تو دور کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹﴾ (الدھر)

''ہم تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں' نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری۔''

میں ایک سخی آدمی کو جانتا ہوں جس نے لوگوں کو ہر طرح سے فائدہ پہنچایا' اُسے ایسے لوگوں سے پالا پڑا جو اُس کی مہربانی کو تو بھول گئے' اُلٹا اسے بدنام کرنے لگے اور اُسے نقصان پہچانے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کے سامنے اس حقیقت کو واضح کر دیا' جس مضمون کے حوالے سے ہم بات کر رہے ہیں' اس طرح وہ بہت مطمئن ہو گیا۔

سابقہ گفتگو کے ساتھ ساتھ میں اپنے اُن بھائیوں کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کر رہا ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے مخلوقِ خدا کی خدمت کی توفیق بخشی ہے اور انہیں جواب میں تکلیف دہ صورتِ حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی خوبصورت بات شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی ہے۔ آپ نے اس موضوع سے متعلق بہت طویل گفتگو فرمائی ہے' فرمایا: ''تمہیں اس طرح کا رویہ سیخ پا نہ کر دے کہ تم لوگوں سے سختی کرنے لگو' ان کے ساتھ نیکی نہ کرو' ان کی طرف سے ملنے والی تکلیف کو برداشت نہ کرو' بلکہ تم ان کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے نیکی کرتے رہو' نہ کہ کسی بدلے کی خاطر نیکی کرو' اور اُن سے نہ ڈرو' اور نہ ہی کوئی امید رکھو۔ لوگوں کے معاملے میں

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو‘ اللہ کے معاملے میں لوگوں سے نہ ڈرو‘ لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے اللہ سے اجر کی امید رکھو‘ نہ کہ اللہ کی بندگی کرتے ہوئے لوگوں کی مدح وثناء کی امید رکھو۔ اور ان لوگوں کے ساتھی بن جاؤ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾﴾ (الّیل)

’’اور اُس (جہنم) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیز گار ہوگا۔ جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے۔ کسی کا اُس پر کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو‘ بلکہ صرف اپنے پروردگارِ بزرگ وبلند کی رضا چاہنے کے لیے۔‘‘

اور ایسے شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿۹﴾﴾ (الانسان)

’’ہم تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں‘ نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری۔‘‘

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس شخص نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لیا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۹۷) ’’تم جو نیکی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے‘‘ وہ نیک کام کرنے میں پیش پیش ہوگا‘ لوگوں کی طرف سے کوتاہی یا سختی پر صبر کرنا اُس کے لیے آسان ہوگا۔ اس کے سامنے اُس کی منزل صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اپنے فضل وکرم اور احسان سے نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر چھوٹے بڑے کام میں اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

۴۷واں اصول:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾

’’جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔‘‘

یہ قرآنِ کریم کا بہت مضبوط اصول ہے جو سورۃ التغابن میں بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾﴾ (التغابن)

’’کوئی مصیبت اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکتی۔ جو اللہ پر ایمان لائے‘ اللہ اسے ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔‘‘

جیسا کہ ظاہر و باہر بات ہے‘ آیتِ کریمہ کھول کھول کر بتا رہی ہے کہ مصیبت چاہے کیسی ہو‘ خواہ اس کا تعلق جان سے ہو‘ مال سے ہو‘ اولاد سے ہو‘ رشتہ داروں سے ہو یا کسی اور چیز سے‘ ہر کام اللہ کے فیصلے اور تقدیر سے ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اجازت سے ہوا کرتا ہے‘ تقدیر کے قلم نے اُسے لکھ دیا ہے‘ اللہ کی مرضی نافذ ہو چکی ہے۔ اور حکمت کے تقاضے کے عین مطابق ہوا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ صبر وتسلیم ورضا کے حوالے سے جو بات بندے پر واجب تھی‘ کیا اُس نے اپنی ذمہ داری پوری کی ہے؟ اور کیا پھر وہ اللہ سے راضی بھی ہے؟ اگرچہ ایسے حالات میں راضی رہنا واجب نہیں ہے‘ بلکہ صرف مستحب ہے۔ ذرا غور کرو‘ کس طرح اللہ تعالیٰ نے دل کی ہدایت کو ایمان کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

مؤمن کے معاملے میں اصل بات یہ ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے خوشدلی سے مشکلات کا استقبال کرنے کے لیے تیار کرتا ہے‘ جزع فزع کیے بغیر‘ جس کام کا حکم شریعت دے اس کی اتباع کے لیے تیار رہے۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ یہ زندگی مشکلات اور پریشانیوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ایمان کا تقاضا ہے‘ اس اصول: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ (التغابن:۱۱) ’’جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے‘‘ میں ثابت قدمی کا اور مشکلات کے وقت صبر کرنے کا اشارہ ہے۔

مشکل کے وقت میں اللہ عزوجل کی طرف سے مؤمن بندے کو ہدایت دینے کا لازمہ ہے کہ مشکلات کی صورت میں اہلِ ایمان ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور اپنے آپ کو حوصلے سے تھام کر رکھیں۔ اسی لیے اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ’’اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے‘‘۔ اس انتہائی بامعنیٰ جملے: ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ’’اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے‘‘ پر بات کے اختتام سے مؤمن کے اطمینان میں اضافہ ہو جاتا ہے‘ اللہ کے علم کی وسعت کے بیان سے اس کی راحت میں اضافہ ہو جاتا ہے‘ اور یہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور اسے خوب علم ہے کہ کون سی چیز بندے کے حق میں اور اس کے دل کے حق میں زیادہ بہتر ہے‘ فوری طور پر یا دیر سے‘ نیز دنیا وآخرت میں اس کے حق میں کونسی چیز زیادہ فائدہ مند ہے۔ یہ آیت پڑھتے ہوئے مؤمن کو نبی اکرم ﷺ کا یہ

فرمان بھی یاد آ جاتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ، اِنْ اَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ)) (صحيح مسلم، ح:٢٩٩٩)

''مؤمن کا معاملہ بھی خوب ہے' اس کا ہر حال بہتری میں ہی رہتا ہے اور یہ مقام مؤمن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ اُسے خوشی ملے تو شکر کرتا ہے' تب بھی اس کے حق میں بہتر' اور اُسے پریشانی ملے تو صبر کرتا ہے' تب بھی اس کے لیے بہتر۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے حوالے سے سلف صالحین نے جو تفسیر بیان کی ہے' اس سے معانی اور بھی زیادہ واضح اور پختہ ہو جاتے ہیں' ذرا تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

١- اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ (التغابن: ١١) ''جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے'' کے حوالے سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اُس کے دل کو یقین سے بھر دیتا ہے' چنانچہ اُسے معلوم ہو جاتا ہے جو کچھ اُسے ملا ہے وہ چوک نہیں سکتا تھا اور جو نہیں ملا' وہ کبھی مل نہیں سکتا تھا۔''

٢- اس اصول: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ ''جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے'' کے حوالے سے علقمہ بن قیسؒ فرماتے ہیں: ''اس آدمی کو جب کوئی پریشانی آتی ہے تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' تو وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس سے راضی رہتا ہے۔''

اس پس منظر میں اس اصول کو بیان کرنے میں بہت ساری اہم باتیں ہیں' جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

١- جیسا کہ گزر چکا ہے' اللہ کی تکلیف دہ تقدیر پر دل کو راضی رہنے کی تربیت دینا۔

٢- سکون واطمینان کے ساتھ پریشانیوں کا استقبال کرنے میں جو بات سب سے زیادہ مددگار ہوتی ہے' وہ اللہ ربّ العالمین پر مضبوط ایمان ہے' کہ مصیبت جھیلتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا۔ اور مؤمن کو اس بات میں کوئی شک نہ ہو کہ اللہ نے جس چیز کو اس کے لیے پسند کیا ہے وہ اس کی پسند سے بہتر ہے اور جب تک وہ مؤمن ہے' اچھا انجام اسی کے حصے میں ہوگا۔

مشکلات آنے کی صورت میں قرآنِ حکیم مندرجہ ذیل صورتوں پر دلوں کی تربیت کرتا ہے:

١- ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ ''جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے''۔ اس اصول کے حوالے سے ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ جیسا کہ گزر چکا ہے' اس میں صبر کرنے اور راضی بقضا رہنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ایمان کو اس قدر پختہ کریں کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کر سکے۔

٢- بڑی مشکلات کے علاج کا ایک قرآنی طریقہ یہ ہے کہ اس عظیم دعا کی طرف راہنمائی فرمائی' جس کا ذکر سورۃ البقرہ میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٥٥ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝١٥٦﴾ (البقرة)

''اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے' دشمن کے ڈر سے' بھوک پیاس سے' مال وجان اور پھلوں کی کمی سے۔ اور اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے' جنہیں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم خود اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔''

٣- انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور اُن کے ماننے والوں کا تذکرہ کثرت کے ساتھ کیا' جن کو مختلف قسم کی مشکلات اور تکلیفیں آئیں۔ اُن کے حالات سے مؤمن عبرت حاصل کر سکتا ہے اور اُن پاک ہستیوں کے نقشِ قدم پر چل سکتا ہے۔ اِس طرح جو مشکلات اُن لوگوں کو پہنچیں اُن کو یاد کر کے اپنی مشکل کو آسان محسوس کرے گا۔ اور ہمارے امام اور راہبر وراہنما رسول اللہ ﷺ مشکلات اُٹھانے والوں میں سب سے آگے ہیں۔

جلیل القدر امام جناب ابوحازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دنیاوی چیزوں کی دو ہی صورتیں ہیں' ایک چیز میرے لیے ہے اور ایک چیز دوسرے کے لیے بنی ہے۔ جو چیز میرے لیے بنی ہے' میں زمین وآسمان کے قلابے بھی ملا دوں اُس کو وقت سے پہلے حاصل نہیں کر سکتا' اور جو چیز دوسرے کے لیے بنی ہے اُس کو نہ میں پہلے پا سکتا تھا اور نہ آئندہ پا سکتا ہوں' نہ میرا رزق دوسرے کو مل سکتا ہے اور نہ دوسرے کا رزق مجھے مل سکتا ہے۔ پھر ان دونوں میں سے کس کے پیچھے اپنی زندگی کھپاؤں؟

آخر کیوں ہم کئی سال پہلے ہونے والے واقعے سے پریشان ہو جاتے ہیں؟ اور کیوں کئی

سال پہلے ناکام ہونے والی شادی کے واقعات یاد کر کر کے اپنے آپ کو سزا دے رہے ہوتے ہیں؟ یا کسی گھاٹے والے تجارتی سودے یا شیئر (حصص) کے خسارے کی یاد میں پریشان ہوتے ہیں؟ گویا ہم اپنے غموں اور پریشانیوں کو تازہ کرتے ہیں۔

اِس اصول کے خاتمہ پر میں آپ حضرات کو ایک انتہائی قیمتی کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دوں گا‘ جو بظاہر بڑی مختصر لیکن معانی کے اعتبار سے بڑی عظیم ہے۔ اور وہ ہے ہمارے شیخ اور ہمارے اُستادوں کے استاد شیخ العلامہ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی رحمہ اللہ کی تالیف ’’الوسائل المفیدۃ للحیاۃ السعیدۃ۔‘‘

۴۸واں اصول:

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾

’’ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا۔‘‘

یہ قرآنِ کریم کا مضبوط اصول ہے‘ جو ایسی ضرب المثل کی شکل اختیار کر گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اللہ کی بہت بڑی حکمت کا مظہر ہے۔ جو شخص اِس اُصول پر غور کر لے اُسے توازن واعتدال کے ساتھ معاملات فہمی میں مدد دے گا۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف کی آیات میں یہ اصول ذکر ہوا ہے‘ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی خاطر پانی کے انتظام کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝۶۰﴾ (البقرۃ)

’’اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا‘ تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو‘ جس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے‘ اور ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا۔ (اور ہم نے کہہ دیا کہ) اللہ کا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔‘‘

اس آیت کریمہ میں سمجھنے کی خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص یہ احسان ذکر کیا ہے کہ جس پتھر سے پانی جاری کیا اس میں بارہ چشمے بنائے‘ جتنے کہ بنی اسرائیل کے قبیلے تھے‘ تاکہ رش اور بھیڑ سے بچا جا سکے اور اُن کے لیے آسانی ہو‘ کہ ہر قبیلہ اپنے پانی کی جگہ کو جان لے۔ جب اُن پر یہ مہربانی ہو گئی تو اُن پر نعمت بھی مکمل ہو گئی‘ اور بغیر کسی محنت

و پریشانی کے ان کے لیے ہر قسم کے کھانے پینے کا انتظام ہو گیا‘ جو کہ خالص اللہ تعالیٰ کے فضل اور رزق کا انتظام تھا۔ پانی کے گھاٹ پر آنے جانے کا مرتب انتظام ہو گیا اور اِس طرح اُن پر اللہ کی نعمت بھی مکمل ہو گئی‘ نتیجتاً وہ سب منظم ہو گئے۔ کوئی کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی کسی کے حق کو کم کر سکتا تھا۔

اس اصول میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں‘ حدیثِ نبویؐ نے اس کی تائید کر دی ہے‘ جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ)) (صحیح البخاری، ح٧١١٢ وصحیح مسلم، ح٢٦٤٨) ’’کام کرتے رہو‘ جس مقصد کے لیے جو کوئی پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔‘‘

جو عملی مثالیں ہم عنقریب پیش کریں گے‘ اللہ کے حکم سے یہ اُصول ان مثالوں کے ذریعے مزید واضح ہو جائے گا۔ مثالیں درجِ ذیل ہیں:

جو صلاحیتیں اور خوبیاں اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں اُن کو جاننا اور پہچاننا بہت اہم ہے‘ تاکہ اس میدان میں فائدہ پہنچائے جو اُس کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے موافق ہو۔ اِس لیے کہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ تمام لوگ صلاحیتوں اور خوبیوں میں یکساں نہیں ہوا کرتے‘ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے علاوہ کسی انسان میں صفاتِ کمال اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ بہت ضروری ہے کہ جس چیز میں انسان کے اندر امتیازی خوبی موجود ہو اُس کی اسے خبر ہو‘ تاکہ اُسی میدان میں اتر کر کام کرے اور بہتر سے بہتر کارکردگی دکھائے اور اُمت کو فائدہ دے سکے۔ صرف مصروف ہونا ہی مقصود نہیں ہے‘ بلکہ اچھی کارکردگی اور عمدہ نتیجہ بھی ضروری ہے۔

جس شخص نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں پر غور کیا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ جس اُصول پر ہم بات کر رہے ہیں: ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ﴾ ’’ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا‘‘ اِس پر انہوں نے پوری طرح عمل کیا۔ اُن میں سے کوئی تو بڑا عالم تھا‘ کوئی جنگ اور قتال کا شاہسوار تھا اور کوئی شعر و خطابت کا ماہر تھا۔

جس اُصول کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں‘ اس کے مفہوم سے ناواقفیت کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ نے بہت سارے لوگوں کی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ایک نوجوان علم کے معاملے میں بہت ممتاز ہے‘ اللہ تعالیٰ نے اُسے عمدہ فہم وفراست کے ساتھ ساتھ حفظ کا ملکہ بھی عطا کیا ہے اور وہ علم کے راستے پر چل بھی رہا ہے‘ اور کوئی آدمی اس کو

خدمتِ خلق کے کاموں میں لگانا چاہے‘ گویا یہ جو علم حاصل کرنے کے کام پر لگا ہوا ہے یہ اُس نصیحت کرنے والے کے نزدیک غیر اہم یا معمولی کام ہے۔ حالانکہ اس کے لیے یہ سب سے بہتر کام ہے۔

ایک دوسرا نوجوان ہے جو علم حاصل کرنے میں خوب محنت کر رہا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اور ترقی بھی نہیں کرتا۔ اردگرد کے لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ یہ اس راستے کا آدمی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ قطعاً حکمت کی بات نہیں ہے کہ اِس سے یا اِس قسم کے آدمی سے مزید محنت کا مطالبہ کیا جائے۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ علم کے راستے کا بندہ نہیں ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ اُسے کسی دوسرے کام میں ڈال دیا جائے۔ اُمت کو بہت سارے دوسرے کاموں میں افراد کی ضرورت رہتی ہے‘ مثلاً فلاحی کاموں میں‘ خدمت خلق کے کاموں میں‘ امدادی کاموں میں‘ معاشرتی اور دعوتی کاموں میں۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مختلف کاموں کے بارے میں توجہ رکھتے تھے۔ اِس بات سے زیرِغور اصول کی صحیح حقیقت سمجھ آ جاتی ہے‘ تاکہ وہ صلاحیتیں ضائع نہ ہو جائیں جن کی ہمیں شدید ضرورت ہے۔ بالخصوص اِس زمانے میں جبکہ کام کے بہت سارے میدان سامنے آ گئے ہیں اور خدمتِ اسلام اور لوگوں تک نفع پہنچانے کی بہت ساری شکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔

نصیب والا تو وہ ہے جسے معلوم ہو کہ وہ کونسا کام اچھی طرح کر سکتا ہے‘ پھر اُسی کام کے ذریعے اپنے دین اور قوم کی خدمت میں جُت جائے۔ حدیث شریف میں بیان ہوا ہے کہ:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اِذَا عَمِلَ اَحَدُکُم عَمَلًا اَنْ یُتْقِنَہُ)) (صحیح الجامع الصغیر للالبانی، ح ۱۸۸۰۔ یہ حدیث حسن ہے)

’’اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ جب تم میں سے کوئی کام کرے تو اسے اچھی طرح کرے۔‘‘

اور وہ آدمی کیسے کسی کام کا ماہر ہو سکتا ہے جسے اس کام کا طریقہ ہی نہ آتا ہو؟

﴿ قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ ﴾ (البقرۃ: ۶۰) ’’ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا‘‘۔ نیز فرمایا: ﴿قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۴) ’’کہہ دیجئے ہر آدمی اپنی آسانی کے مطابق کام کرتا ہے‘‘۔ وحی سے حاصل ہونے والی راہنمائی پیش کر دی ہے۔ نیز

آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہُ)) (متفق علیہ) ’’کام کرتے رہو‘ پس جس مقصد کے لیے جو کوئی پیدا کیا گیا ہے وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا ہے۔‘‘

کیا ہم ان باتوں پر غور کریں گے اور عمل کریں گے‘ تاکہ اپنی صلاحیتوں سے بہتر سے بہتر فائدہ اٹھا سکیں؟

۴۹واں اصول:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾

’’پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرو۔‘‘

یہ قرآن کریم کا ایک اور محکم ضابطہ ہے‘ کہ انسان اپنے رب کی طرف صحیح طریقے سے کیسے چل سکتا ہے؟ عبادات‘ معاملات اور کردار کو کیسے ٹھیک کر سکتا ہے؟ دین کے معاملے میں جس چیز کا علم نہ ہو یا سمجھ نہ آ رہا ہو‘ اُسے کیسے جان سکتا ہے؟ اِن سب میدانوں میں اس اُصول کے بہت ہی اچھے اثرات ہیں۔ کتاب اللہ میں یہ اصول انہی الفاظ کے ساتھ دو دفعہ ذکر ہوا ہے‘ ایک دفعہ سورۃ النحل (آیت ۴۳) میں اور دوسری دفعہ سورۃ الانبیاء (آیت ۷) میں۔ دونوں مقامات پر حق کو قبول کرنے میں اکڑنے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم سے پہلے جو اہلِ کتاب گزرے ہیں اُن سے پوچھ کر دیکھ لو۔ اس راہنمائی کے اندر واضح اشارہ ہے کہ ان اکڑنے والے مشرکوں کو قطعاً علم نہیں ہے اور وہ پرلے درجے کے جاہل ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی تو ان کو سوال کرنے کی راہنمائی میں کوئی فائدہ نہ تھا۔

جب آپ سورۃ النحل اور سورۃ الانبیاء کے پس منظر میں اس اصول پر غور کریں گے تو آپ کو بہت ساری باتوں کا علم ہو جائے گا:

۱- اس اصول میں اہلِ علم کی تعریف کی گئی ہے۔

۲- یہ کہ سب سے اعلیٰ علم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کا ہے‘ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جس شخص کو اللہ کی نازل کردہ وحی کا علم نہ ہو وہ تمام حالات میں اہلِ علم سے رابطہ کرے۔

۳- سوال کرنے والا اور جاہل صرف سوال کر لینے سے ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم کو اپنی وحی اور اس کی تلاوت پر امین مقرر کیا ہے اور انہیں اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ اپنی ذات کا تزکیہ کیا کریں اور اچھی صفات کو اپنائیں۔

۴- یہ اصول اس بات کی طرف بھی راہنمائی کر رہا ہے کہ اہلِ ذکر میں سے سب سے افضل

اہلِ قرآن ہیں۔ درحقیقت یہی اہلِ ذکر دوسروں کی بجائے اس نام کے زیادہ حق دار ہیں۔

۵- اس میں علم حاصل کرنے اور اہلِ علم سے دریافت کرنے کا حکم ہے۔ اُن سے دریافت کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو تعلیم دیں اور اپنے علم کے مطابق لوگوں کے سوالوں کے جواب دیں۔

۶- اہلِ ذکر اور اہلِ علم سے سوال کرنے کو اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ جاہل اور بے علم سے سوال کرنا منع ہے' اور اُسے یہ کام کرنا بھی نہیں چاہیے۔

کچھ لوگوں کی طرف سے اِس اصول پر عمل کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے اور اُس کی مختلف شکلیں ہیں:

۱- آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کچھ لوگوں کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے یا انہیں سوال کی ضرورت پیش آتی ہے تو جو بھی اُن کے پاس سے گزرے اُس سے پوچھ لیتے ہیں' خواہ اُنہیں اس کے حال کا بھی علم نہ ہو کہ آیا وہ اہلِ علم میں سے ہے یا نہیں؟ اور بعض لوگ ظاہری شکل پر اعتماد کر لیتے ہیں' جب کسی کو دینی شکل کا دیکھا تو اسے طالبعلم یا عالم سمجھ کو اس سے فتویٰ پوچھ لیا۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے۔

مجھے خبر نہیں' جب ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو جو کوئی راستے سے گزرتے ہوئے مل جائے اُس سے علاج پوچھ لیتے ہیں یا معروف و مشہور ڈاکٹر کے پاس جا کر علاج کراتے ہیں؟

مجھے معلوم نہیں کہ جب اُن کی گاڑی خراب ہو جائے یا اس میں کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے' کیا یہ قریبی گزرنے والے کو ٹھیک کرنے کے لیے دے دیتے ہیں یا کسی ماہر مکینک کو ڈھونڈتے ہیں' جو گاڑی ٹھیک کرنے میں تجربہ رکھتا ہو؟ جب دنیوی معاملات کی اصلاح میں یہ طریقہ کار ہے تو دین سے متعلقہ معاملات کی اصلاح میں اضافی احتیاط کی ضرورت ہے' کیونکہ وہ زیادہ عظیم اور پرخطر ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ علم' دین ہے' چنانچہ خوب گہرائی سے دیکھو کہ کس سے دین لے رہے ہو۔''

۲- اس اصول کی خلاف ورزی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ برحق اہلِ ذکر سے علم لینے کی خاطر تحقیق نہ کرنا' اس لیے کہ علم کے دعوے دار تو بہت ہیں اور اُن کی مشابہت بنانے والے اور بھی زیادہ ہیں۔ جو آدمی ٹی وی چینلز پر پروگرام کرنے والوں کو دیکھتا ہے' اُسے اس حقیقت کا کچھ نہ

کچھ پتا چل جاتا ہے' چونکہ لوگوں کے پاس حقیقی علم کی کمی ہے اور عالم و جاہل میں تمیز بھی نہیں کر سکتے' اِس لیے جسے اسلام کا نام لیتا دیکھتے ہیں اُسے ہی عالم سمجھ لیتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس سے شرعی مسئلہ پوچھا جا سکتا ہے۔ وہ شعلہ بیان مقرر یا خطیب اور حقیقی عالم کے درمیان فرق نہیں کر سکتے جسے دلائل کے مراجع و مآخذ کا علم ہو اور شرعی دلائل کی حقیقت سے واقف ہو۔ اس صورت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سارے بے بنیاد فتوے بھی لوگوں میں معروف ہو گئے' بلکہ ایسی غلطیاں بھی' جنھیں کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی قبول کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ذاتی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور عام لوگ رخصتوں کو تلاش کرنے لگ گئے ہیں۔ نتیجتاً اُن کا دین سے تعلق کمزور ہو گیا ہے اور اطاعت کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے' جس کا اہم ترین سبب کمزور فتوے ہیں جو بہت سارے ٹی وی چینلز سے جاری ہو رہے ہیں۔

اس مختصر سی وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سوال کرتے وقت احتیاط کو پیشِ نظر رکھیں اور صرف اُس شخص سے سوال پوچھیں جس کی ذمہ داری کا یقین ہو' وہ متقی ہو' سب سے بہتر علم والا ہو اور اُسے اللہ کا خوف ہو۔ درحقیقت یہی صحیح اہلِ ذکر ہیں' جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۴۳﴾ (النحل) ''پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرو!''

۵۰واں اصول:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (بنی اسرائیل:۹)

''یقیناً یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بہت ہی سیدھا ہے۔''

کتاب کو ہم اس اصول کے بیان پر ختم کر رہے ہیں جس کی مناسبت بہت واضح ہے۔ یقیناً یہ اصول مؤمن کے نزدیک عظمتِ قرآن میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ تنہا کتاب ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے مفید ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے اس اصول کو چند کلمات میں واضح کر دیا ہے۔ فرمایا: ''یہ قرآن تمہیں بیماری بھی بتاتا ہے اور علاج بھی بتاتا ہے۔ تمہاری بیماری گناہ اور غلطیاں ہیں اور دوا استغفار کرنا ہے''۔ اس عظیم امامِ تفسیر کی طرف سے بہت واضح اشارہ ہے کہ قرآن کریم ہر قسم کی بیماری کا علاج ہے اور اس میں ہر دوا موجود ہے۔ اب اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ قرآنِ کریم سے اِن دواؤں کو ڈھونڈ نکالیں۔

جو شخص اس حوالے سے اہلِ علم کی محنتوں کا جائزہ لینا چاہے‘ علامہ الشنقیطی نے اپنی تفسیر ’’اضواء البیان‘‘ میں اِس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ اِس کا مطالعہ کرلے‘ اور جس اصول پر ہم یہاں بات کررہے ہیں‘ علامہ نے اس مقام پر تقریباً ساٹھ صفحات لکھے ہیں۔ آپ نے چند مثالیں پیش کی ہیں جن میں قرآن نے مسائل کا حل پیش کیا ہے اور لوگوں کو مسائل کے حل کا راستہ دکھایا ہے۔ زیرِغور اصول کی وضاحت کے ساتھ جس بات کا براہِ راست تعلق ہے اس کا کچھ حصہ پیش کردیتا ہوں۔ آپؒ فرماتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اجمالاً بتا دیا ہے کہ قرآن کریم میں ہر کام کی بہترین راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کی طرف ہدایت کو شامل ہے- ان شاء اللہ- ہم کئی طرح کی بہت ساری مثالیں پیش کریں گے‘ جن میں قرآنِ کریم نے انتہائی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کی ہے۔‘‘

اس کے بعد علامہ نے بہت سارے مسائل بیان کیے ہیں جن کا عقائد‘ معاشرتی مسائل اور دوسرے مضامین کے ساتھ تعلق ہے۔ اور انہی مثالوں میں سے ہے:

’’یہ قرآن بہت صحیح راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں‘ اس کی سوچ اور کردار میں اور اس کے عقیدے اور اعمال میں اعتدال اور توازن ہونا چاہیے۔

قرآن عبادت کے میدان میں بھی بہت صحیح راہنمائی کرتا ہے کہ شرعی حکم اور انسانی طاقت کے درمیان توازن رکھا جائے کہ نہ تو شرعی حکم انسانی نفس پر اتنا بھاری ہو کہ وہ اُکتا جائے اور ذمہ داری سے مایوس ہو جائے اور نہ ہی اتنا آسان اور ہلکا ہو کہ نفس اسے بے وقعت اور بے قیمت سمجھ لے۔ پس نہ تو اعتدال و توازن کی حدود سے نکلو اور نہ ہی برداشت کی حدود کو پار کرو۔

قرآن انسانوں کے باہمی تعلقات میں انتہائی مضبوط راہنمائی فراہم کرتا ہے چاہے ان کا تعلق باہم افراد کے درمیان ہو‘ میاں بیوی کے درمیان ہو‘ حکومتوں اور قبیلوں کے درمیان ہو یا ملکوں اور قوموں کے درمیان ہو‘ جو کہ معروف و مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے چاہئیں۔ پسند ناپسند کی وجہ سے متأثر نہ ہوں‘ دوستی یا دشمنی کی وجہ سے سیدھے راستے سے نہ ہٹیں‘ اور نہ ہی ذاتی غرض اور مفاد کی وجہ سے اُن میں تبدیلی آئے۔

اور قرآن بڑی مضبوط راہنمائی دیتا ہے کہ تمام آسمانی ادیان کو اپنی بنیادوں پر قائم رہنا چاہیے‘ اور ان کا آپس میں رابطہ ہونا چاہیے‘ ان کے مقدسات کی تعظیم ہونی چاہیے اور

محترم مقامات کی حفاظت ہونی چاہیے۔ اس طرح تمام انسان‘ اپنے آسمانی مذاہب کے عقائد کے ساتھ امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکتے ہیں .....‘‘ (علامہ مذکور کی گفتگو یہاں پر مکمل ہوئی۔)

یہ ایسا اصول ہے جو اہلِ اسلام میں سے شکست خوردہ اور مایوس مسلمانوں (سے مایوسی) کا راستہ بند کرتا ہے‘ یا ایسے بے دین لوگ جن کا خیال ہے کہ قرآن صرف وعظ و نصیحت کی کتاب ہے اور صرف چند ایک مسائل کا حل پیش کرتا ہے‘ باقی بڑے بڑے مسائل کے حل پیش کرنے کے قابل نہیں ہے جیسے کہ سیاسی مسائل ہیں یا عالمی سطح کے مسائل ہوتے ہیں۔

یہ باتیں خطرناک ہونے سے آگے بڑھ کر کفریہ بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی بھی ہے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات علیم و خبیر ہے۔ جب اس نے قرآن نازل فرمایا اُسے خوب معلوم تھا کہ لوگوں کے سامنے بہت بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں گی‘ بہت سارے راستے کھلیں گے اور تعلقات پھیلیں گے اور نئے حالات پیدا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو یونہی بے کار نہیں چھوڑ دیا ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو محفوظ فرما دیا ہے تاکہ لوگ ہدایت پانے کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی خاطر سنتِ نبوی کی بھی حفاظت فرمائی ہے تاکہ قرآن کریم میں بیان ہونے والے جو اصول لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں‘ یہ سنت اس کی وضاحت کردے۔ اس کے ساتھ ساتھ سنت میں بھی مستقل احکام بیان ہوئے ہیں۔ جو آدمی ہدایت کا سچا طلب گار ہو اسے ان دونوں سے ہدایت مل سکتی ہے۔ ہاں البتہ جس کی آنکھوں میں ٹیڑھا پن ہو یا اس کا دل ہی اندھا ہو وہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔ وحی کے ذریعے ملنے والے شرعی اصولوں کو نقص یا کمزوری کا الزام نہ دے۔

ہمارے ربّ کی طرف سے آنے والی کتاب (قرآن مجید) ہمیں بتا رہی ہے کہ جو سیدھا چلنا چاہے یہ اُسے ہدایت دے گی۔

قرآن حکیم سے ہدایت کے متلاشی کہاں ہیں؟

اس کے حوض سے پانی بھرنے والے کہاں ہیں؟

اور اس کی راہنمائی سے ہدایت پانے والے کہاں ہیں؟

(وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین!)

❁❁❁

سُنّتِ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ربّ العالمین نے انسانوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور اُن کے اختتام پر سید المرسلین ﷺ کو مبعوث فرمایا' اور ان پر اپنا کلام بصورتِ قرآن مجید نازل کیا۔ قرآن پاک فیصلہ کن کتاب ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی قرآنی تعلیمات کے موافق اور منشاء الٰہی کے مطابق تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے یہی فرمایا تھا کہ آپؐ کا اخلاق قرآن کریم ہی تو ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اوامر ونواہی کے ذریعے انسانوں کو اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن انسان ان احکام پر عملی اعتبار سے کئی قسم کے عذر پیش کر سکتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے حامل قرآن ﷺ کو قرآن پر عملی نمونہ کے طور پر پیش کر دیا' اس طرح ثابت ہو گیا کہ قرآن کی تعلیمات سے روگردانی پر کوئی عذر قابل قبول نہیں۔ محبوبِ ربّ العالمین ﷺ نے افلاس وتونگری' صحت و بیماری' سفر وحضر' کمزوری وغلبہ' شوہر اور حاکم' سپہ سالار اور منتظم' غرض ہر قسم کے حالات میں معیاری طرزِ عمل چھوڑا ہے جو قرآنی منشاء کو بھی پورا کرتا ہے اور بنی نوع انسان کے لیے بہترین نمونہ بھی ہے۔ خود قرآن حکیم میں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔

اب تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کو خالق کائنات کی منشاء کے مطابق گزار کر اللہ تعالیٰ کی لافانی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے طریقِ نبویؐ کو اپنانے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سچ فرمایا ہے حضرت سعدی شیرازیؒ نے ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آنحضرت ﷺ کی زندگی سے عملی نمونہ نہ ملتا ہو۔ اس لحاظ سے آپؐ کی پوری زندگی میں انسانی حیات کے تمام تقاضوں کا مکمل اور کامل جواب موجود ہے۔

آپ ﷺ کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں' لڑکے پیدا ہوئے' آپؐ نے ان کی پیدائش پر جس طرزِ عمل کو اختیار کیا یقیناً وہی بہترین ہے۔ لیکن حضور ﷺ کے اُسوہ کے باوجود اگر کوئی شخص بیٹی کی پیدائش پر دل تنگ اور بیٹے کی پیدائش پر دل شاد ہوتا ہے تو ایسے شخص پر سنت کی اہمیت اور رسالت کا مقام واضح نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی بیٹیاں جوانی کی عمر کو پہنچیں' آپؐ نے ان کے نکاح کیے۔ لڑکیوں کی شادیاں کرنے والے طریق نبویؐ کو اپنانا چاہیں تو بخوبی اپنا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کے بچے چھوٹی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ اس پر آپؐ نے جس صبر وتحمل کا نمونہ پیش کیا' وہ آج اور رہتی دنیا تک اچھے لوگوں کے لیے راہ نمائی ہے۔ بیٹیوں کے نکاح کے موقع پر بے سروپا رسوم کی پابندی اور نام ونمود کی خاطر بے جا تبذیر سنتِ رسول میں مفقود ہے۔ اسی طرح عزیزوں کی وفات پر مختلف ناموں سے دعوتوں کا انعقاد سنتِ رسول میں ہرگز نظر نہیں آتا۔ مُردے کو تجہیز وتکفین کے بعد قبر میں اتارنا' پھر قبر بنانا آنحضرت ﷺ سے سیکھنا چاہیے۔ آپؐ نے قبریں پختہ بنانے اور ان پر عمارت کھڑی کرنے سے روکا ہے۔ اس کے باوجود قبریں پختہ بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے کو باعث ناراضیٔ رسول نہ سمجھنا بھی عجیب منطق ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بزرگوں کا اکرام ملحوظ ہے' لیکن وہ لوگ یہ چیز بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اکملیت اور جامعیت کے بلند ترین درجے پر واقع ہے' اگر بزرگوں (زندہ اور فوت شدہ) کا اکرام ملحوظ ہے تو وہ بھی آپؐ ہی سے سیکھنا ہے۔ کیا یہ آپ ﷺ کا فرمان نہیں ہے کہ ''جس نے ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کی اور چھوٹوں پر رحم نہ کیا وہ ہم میں سے نہیں؟'' کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کے اس فرمان سے بے خبر تھے؟ ۳ھ میں جنگ اُحد کے موقع پر آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپؐ کی پرنم آنکھوں کے سامنے اُن کا کفن دفن کیا گیا اور قبر بنائی گئی' وہ قبر نہ پختہ ہوئی اور نہ اس پر عمارت بنی۔ حضرت حمزہؓ کو آپؐ نے سید الشہداء قرار دیا۔ کیا حضرت حمزہؓ سے بڑھ کر کوئی اکرام کا مستحق ہے؟

زندگی کا کون سا گوشہ ہے جہاں آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے راہ نمائی نہیں مل سکتی؟ آپؐ نے اپنے پروردگار کی عبادت رات کو خلوت میں اور دن کو لوگوں کے سامنے کی۔ رات کی عبادت کی کیفیت ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی زبانی ہم تک پہنچ چکی ہے اور دن کی عبادات چشم دید گواہوں نے بتائی ہیں۔ فرض نمازوں کے لیے مسجد اور نفل نمازوں کے لیے گھر کو اختیار کرنا سنتِ نبویؐ ہے۔ پھر مراسمِ عبودیت قیام' رکوع' سجود' قعدہ میں بالترتیب قرآن کی تلاوت' بندگی کا اقرار' خدا کی کبریائی اور عظمت کا اعتراف اور دعائیں ہیں۔ یہ طریقِ نبویؐ

ہے۔ جنگل میں جا کر عبادت‘ مسجد اور جماعت کے بغیر نماز‘ پھل اور اچھی غذائیں چھوڑ کر نمکی اور بھدی غذاؤں کا استعمال‘ جسم کو گندا اور غلیظ رکھنا‘ الجھے ہوئے بال اور میلے کچیلے کپڑے پہننا‘ پاؤں میں گھونگھرو باندھنا‘ تجرد کی زندگی گزارنا‘ پانی میں کھڑے ہو کر اوراد و وظائف کرنا‘ قبر پر مجاورت کرنا اور اس کے علاوہ دوسری مصنوعی عبادتیں جب پیغمبر ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں نہیں ہیں تو ان میں نفع کی بجائے سراسر نقصان اور خسران ہے۔ کیونکہ ناقص اور ادھوری چیز میں تو اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن مکمل‘ کامل اور جامع ترین شے میں اضافہ اُس کے حسن و کمال میں نقص کا باعث ہوگا۔ کوئی ایسی خیر‘ بھلائی یا خوبی نہیں ہے جو پیغمبر ﷺ کے اُسوہ میں نہ ملتی ہو۔

اُسوۂ حسنہ کا جواب تو ملنا محال ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کمال کے اُس مقام پر ہے کہ کوئی دوسرا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ آپؐ کے پیروکاروں نے بھی اس درجہ آپؐ کی اتباع کی ہے کہ خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو! تم پر میرے طریقے کی پیروی اور میرے حق پرست خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں جب ہم خلفائے راشدین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ان بزرگوں کی زندگی بھی اُن ہی نقوش کا مجموعہ ہے جو اُسوۂ حسنہ میں پائے جاتے تھے۔ شادی بیاہ‘ پیدائش و وفات‘ خوشی اور غمی‘ جنگ اور امن میں جو طریقہ آپ ﷺ نے اپنایا وہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے۔ عبادت جس طرح آپؐ نے کی اُسی طرح صحابہ نے۔ الغرض خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کی اُس کامل اور مکمل صورت کو جو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سیکھی بالکل اُسی طور پر اپنا لیا اور اس طرح آپؐ کی نظروں میں قابل اعتماد ٹھہرے۔ انہوں نے اپنی پسند و ناپسند کو قطعاً معیار نہ بنایا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اسوۂ حسنہ ہی کی پیروی کی اور اس میں کچھ کمی یا زیادتی نہ کی۔

آج کل مادی ترقی کا دور ہے۔ ایجادات نے بود و باش کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس دور کے کچھ چیلنجز ہیں‘ لیکن اسلام میں ہر دور کے چیلنجز قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ علمائے وقت ایسے مسائل میں اجتہاد کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریل گاڑی یا ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نماز کی ادائیگی کیسے کی جائے۔ ٹیلیفون پر ایجاب و قبول کا انعقاد وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو زمانہ نبوی اور خلفائے راشدینؓ کے عہد کے بعد کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ علمائے عصر حاضر جن کو قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم میں دسترس حاصل ہو‘ ان مسائل کا حل بتائیں گے۔ علماء کے اجتہادی اختلاف کی صورت میں کسی مجتہد کا فیصلہ اقرب الی الصواب سمجھ کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طریقِ عبادت اور دوسری تمام باتیں جن میں دربارِ نبویؐ کا فیصلہ

پہلے سے موجود ہو‘ ان میں کوئی دوسری راہ اختیار کرنا تو سراسر خسرانِ مبین ہے۔

سنتِ رسول ﷺ اور طریقِ صحابہؓ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا طریقہ معیار قرار نہیں پا سکتا‘ کیونکہ اُسے کوئی سند حاصل نہیں۔ سنتِ رسول تو اللہ کی طرف سے ہے اور طریق صحابہ کو خود رسول اللہ ﷺ نے معیار قرار دیا ہے۔ اب تو وہی شخص اللہ کا مقرب بندہ اور ولی اللہ ہوگا جس کا راستہ بس سنتِ رسولؐ اور طریقِ صحابہؓ کے مطابق ہو۔ لیکن ایسا شخص بھی اُمت کے لیے مطاع نہیں ہوگا‘ بلکہ پسندیدہ ہوگا۔ وجہ اُس کی یہ ہے کہ جزئیات تک کامل نمونہ حیات تو صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہوتے ہیں‘ جن کو معصوم رکھنا مشیت ایزدی سے ہوتا ہے۔

شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنے ابنائے جنس کے کچھ افراد سے اچنبھے اور نرالے کام دیکھ کر ان کے ساتھ اظہارِ عقیدت شروع کر دیتے ہیں‘ اور آہستہ آہستہ یہی جذبہ شخصیت پرستی تک لے جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی شناعت واضح ہے کہ معیاری زندگی تو اتباعِ رسول ﷺ میں ہی ہو سکتی ہے۔ اگر نرالے اور اچنبھے کام کر گزرنا بزرگی کی علامت ہے تو یہ علامت سامری میں بھی موجود ہے اور بہت سے غیر مسلم جوگی‘ راہب‘ جادوگر اور شعبدہ باز خوارقِ عادات کے لیے آج بھی مشہور ہیں‘ جن کی زندگیوں میں لہو و لعب کے علاوہ خدا پرستی بھی مفقود ہے۔ پھر ایسے افراد میں بزرگی کس بنیاد پر تسلیم کی جائے؟

شخصیت پرستی گمراہی کی جڑ ہے۔ ہر قسم کی گمراہیاں اور توحید کی خلاف ورزی اسی سے جنم لیتی ہے۔ ابلیس لعین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے شروع سے آج تک اس ہتھیار کو بڑی کامیابی سے استعمال کر رہا ہے۔ لوگ کسی شخص میں نرالا پن اور شعبدہ بازی دیکھ کر اُسے بزرگ سمجھنے لگتے ہیں اور پھر اُس کے طور و اطوار کو بنگاہِ عقیدت دیکھنے لگتے ہیں‘ یہاں تک کہ اُس بزرگ کی پسند ناپسند کو معیاری قرار دے لیتے ہیں۔ مسلمان بھی اس مرض کا شکار نظر آتے ہیں جب وہ اظہارِ عقیدت میں غلو کرتے ہوئے بعض لوگوں کے طرزِ عمل کو معیاری قرار دے لیتے ہیں اور اس طرح آنکھیں بند کر کے مطاعِ حقیقی کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی مجاورت بر قبور کو صائب سمجھنے لگتا ہے تو کسی کی نظر میں قوالی بھلی معلوم ہوتی ہے‘ کوئی جنگل میں عبادت کو تقرب اِلی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے تو کوئی مجرد رہنے میں بھلائی خیال کرتا ہے۔ گویا پہلے بوجوہ ایک شخصیت کو بھلا سمجھ لیا اور بعد ازاں اُس کے افعال کو معیاری قرار دیا‘ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خلافِ سنتِ رسول ﷺ عمل کر کے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مطاع بن کر لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے‘ بلکہ اب ہر شخص کی بھلائی اسی میں ہے کہ معراجِ انسانی کی انتہا تک

پہنچ جانے والی ہستی (ﷺ) کی پیروی کرے۔

کسی شخص کے حق میں رائے عامہ ہموار ہو جاتی ہے' جبکہ لوگ کسی کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ کسی کو حالات سازگار ملتے ہیں اور کسی کی زندگی الجھنوں اور مصیبتوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ کوئی عرصۂ دراز تک بیمار رہتا ہے' کسی کو عمر بھر بیماری نہیں آتی۔ کوئی خوبصورت ہوتا ہے اور کوئی بدصورت' لیکن ان میں سے کسی کو بھی خدا رسیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ ان میں سے جو شخص بھی سنتِ رسولؐ کی پیروی کو مضبوطی سے اختیار کیے ہوئے ہے وہ بہر حال نیکوکار اور ولی اللہ ہے' خواہ اُس کی مخالفت ہو رہی ہے یا موافقت' خواہ اُس کے شب و روز بیماری میں گزر رہے ہیں یا صحت میں۔ الغرض معیارِ حق پرستی نہ رنگ و نسل ہے' نہ دکھ تکلیف' نہ آرام و سکون' نہ دولت و غربت' نہ قبولِ عام نہ عدمِ قبولِ عام' نہ ظہور خوارق نہ عدم ظہورِ خوارق' بلکہ معیار ہے تو صرف اتباعِ طریق نبوت ہے اور بس۔ اور یہ معیار کسی انسان' جن یا فرشتے کا بنایا ہوا نہیں' بلکہ خود خالق دو جہاں کا بنایا اور بتایا ہوا ہے۔ اس معیار کے قیام و بقا کے لیے پیش بندی کے طور پر قرآن میں دین کی بتمام و کمال جامعیت کے ساتھ پسندیدگی کا اعلان کیا گیا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے دین میں کمی بیشی کرنے والوں کو مَردود گردانا۔ یہی سبب ہے کہ حق شناس مسلمان بزرگوں نے جو کچھ عمل کیا اتباعِ سنت میں کیا اور اپنی کسی بات یا کسی عمل کو حجت نہ ٹھہرایا جو سنت میں موجود نہ ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بڑا معروف ہے کہ اگر میری کوئی بات صحیح حدیث کے خلاف ہو تو اُسے دیوار کے ساتھ دے مارو۔

یوں سمجھئے کہ دین حق اور سنتِ رسول ﷺ دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ سنت رسول کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ خواہ کس قدر چمکدار اور مزین نظر آئے' وہ سراب اور دھوکا ہے۔ صراطِ مستقیم صرف ایک ہی ہے اور وہ سنتِ رسول ﷺ ہے۔ جس طرح دین کے مقرر کردہ کاموں میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح زیادتی کرنا بھی ناجائز ہے۔ کمی کرنے کی برائی تو واضح ہے' لیکن زیادتی کرنا اس لیے مذموم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کمال کی انتہا پر تو پہلے ہی موجود ہے۔ زیادتی یا اضافے کا جواز تو وہاں ہے جہاں پہلے نقص ہو اور اس کو دور کرنا مقصود ہو یا خوب کو خوب تر کرنا منظور ہو۔ لیکن جو چیز خوب ترین ہو اور اُسے خوب ترین بھی خود خدائے بزرگ و برتر نے بنایا ہو اُس میں اضافے کی گنجائش تسلیم کرنا تو سراسر جہالت اور خسران ہے۔ مثال کے طور پر درود شریف کے الفاظ خود آنحضرت ﷺ نے سکھلا دیے ہیں۔ اب اپنی طرف سے اگر کسی انسان نے کچھ کلمات تصنیف کر لیے اور ان کو درود کا نام دے دیا اور اس کے وظیفے کو مفید تر بتایا تو یہ صرف گمان ہے۔ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ہزاروں اور

لاکھوں کلمات برکت اور فائدے کے اعتبار سے سرورِ کائنات ﷺ کے بتائے ہوئے ایک کلمے کے برابر تو کجا عُشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات پیدا کرے کہ جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے۔ پس دین میں نئی بات پیدا کرنا اور اُسے بدعت حسنہ کہنا دوہرا جرم ہوا۔ اذان کے الفاظ کے اول و آخر الفاظ کا اضافہ اور نمازِ جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر ''صلوٰۃ و سلام'' کا التزام وغیرہ نہ سنت میں موجود ہے نہ خلفائے راشدین کے عمل میں' لہٰذا یہ سب کچھ بدعت ہوا۔ دین اسلام یعنی اللہ کا پسندیدہ دین وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کامل صورت میں نبی اکرم ﷺ پر نازل فرمایا اور اُسوہ رسولؐ کی صورت میں لوگوں پر مبرہن کر دیا۔ وہی آسان ترین اور سادہ ترین دین ہے۔

کچھ لوگ پوچھیں گے کہ پھر تو ریل اور ہوائی جہاز کا سفر اور جنگ میں توپ' بندوق اور جدید اسلحہ کا استعمال بھی ناجائز ہوا؟ لیکن یہ بات درست نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق ایجادات سے ہے۔ چونکہ ان کا وجود ہی دورِ نبویؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں ملتا اس لیے علمائے مجتہدین کا قول قابل قبول ہو گا جو وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت ان کے استعمال کو متفقہ طور پر جائز قرار دیتے ہیں۔ اُس وقت اونٹوں اور گھوڑوں کا سفر تھا تو اب جدید ذرائع کے استعمال نے سفر کی سہولتوں کو بہتر اور رفتار کو تیز کر دیا ہے۔ جنگ میں اُس وقت تیر اور تلوار ہوتے تھے' اب دشمن کے پاس زیادہ مہلک ہتھیار ہیں تو مسلمان کو بے خبر رہنا اور صرف تیر اور تلوار پر اکتفا مناسب نہیں۔ لیکن ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی ﷺ کا نام دے کر اپنی مرضی کے مطابق اس دن کا پروگرام بنانا یقیناً دین میں اضافہ ہے' کیونکہ ۱۲ ربیع الاول کا دن نبوی زندگی میں ۲۳ دفعہ آیا اور خلفائے راشدین کے عہد میں ۳۰ مرتبہ آیا' لیکن نہ سنت سے اُسے منانا ثابت ہے اور نہ خلفائے راشدین نے اُسے منایا۔ اگر اس عید کے ایجاد میں حُبِ نبی ﷺ کارفرما ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سے کیوں غافل رہے جو نبی مکرم ﷺ کے ساتھ حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ حُبِ نبیؐ کا بہترین مظاہرہ صحابہؓ نے کیا۔ وہاں نام و نمود' شور و شغب اور دکھلاوے کی خاطر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ پس محبت کا نو ایجاد مظاہرہ یقیناً ناقص ہے اور اسی لیے اس کے نتائج میں مفاسد کا ظہور لازمی ہے۔

آج ہمارے لیے بھی صحیح راہ یہی ہے کہ سنتِ رسول ﷺ اور سنتِ خلفائے راشدینؓ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ محبت کرنے کا وہی طریقہ اپنائیں جو تن من دھن کی بازی لگا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنایا۔ ❁❁❁

جھوٹ: تمام برائیوں کی جڑ

حافظ محمد مشتاق ربانی

حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر چیز سچ ہوگی یا جھوٹ اور ہر قول وفعل ان دو کے گرد ہی گھومتا ہے۔ جھوٹ سچ کا (متضاد) ہے۔ جھوٹ ہر برائی کی جڑ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا جس میں کئی برائیاں تھیں۔ آپؐ نے اسے صرف جھوٹ بولنے سے منع کیا۔ جھوٹ نہ بولنے کی وجہ سے وہ تمام برائیوں سے آخر کار چھٹکارا پا گیا۔ قرآن مجید میں جھوٹ کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ سورۂ آل عمران میں آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ نصاریٰ اگر آپؐ کی طرف سے پوری وضاحت کے بعد بھی کٹ حجتی کا مظاہرہ کریں تو پھر آپؐ انہیں مباہلہ کی دعوت دیں: ﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱﴾ (آلِ عمران) ''پھر ہم سب مل کر دعا کریں اور لعنت کریں اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں''۔ جھوٹ کے کس قدر سخت اثرات جھوٹے پر ہوں گے' آپ خود اندازہ کر لیں۔ لعنت ایسی بددعا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے غصہ میں اونٹنی پر لعنت کی تو آپؐ نے اس اونٹنی کو باقی اونٹوں سے علیحدہ کرنے کے لیے کہا' کیونکہ وہ لعنت زدہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹﴾ (التوبۃ) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرو''۔ یعنی سچائی اور سچے لوگوں کا ساتھ دو اور ان کی صحبت اختیار کرو تاکہ سچائی کا رنگ تم پر بھی چڑھ جائے۔ سچ اور جھوٹ کی بابت رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ

عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا)) (صحیح مسلم)

''تم پر سچ بولنا لازم ہے' کیونکہ سچ بولنا نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کا راستہ دکھاتی ہے۔ اور انسان لگاتار سچ بولتا رہتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اور تم لوگ جھوٹ بولنے سے بچو' کیونکہ جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کا راستہ دکھاتی ہے' اور انسان لگاتار جھوٹ بولتا رہتا ہے' جھوٹ بولنے کا متمنی رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ہاں ہوسکتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ بخیل ہوسکتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ہاں ہوسکتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: نہیں' وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ ظہورِ نبوت سے قبل تاجدارِ ختمِ نبوت ﷺ **الصّادق والامین** کے لقب سے مشہور تھے۔ ہرقل' روم کا بادشاہ تھا' اُس نے قریش کے سردار ابوسفیان سے اس وقت پوچھا جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اسلام کے مخالفین میں بہت نمایاں تھے: **هل كنتم تتهمونه بالكذب** ''(جو شخص اپنے آپ کو نبی کہتے ہیں) کیا انہوں نے تم سے کبھی جھوٹ بولا؟'' ابوسفیانؓ نے بتایا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ گویا یہ وہی بات ہوئی: **اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ** ''فضیلت اور خوبی وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں''۔ دشمن آپ ﷺ کے سچ بولنے کے معترف ہوئے۔ آپؐ کی انہی فضیلتوں کی وجہ سے آپؐ کے بہت سے دشمن دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

جھوٹ کے مختلف پہلو ہیں۔ ملاوٹ بھی جھوٹ ہے' چوری بھی جھوٹ ہے' بہتان بھی جھوٹ ہے' الیکشن میں دھاندلی بھی جھوٹ ہے۔ بعض لوگ نقصان سے بچنے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے جھوٹ بولتے ہیں اور بعض فائدے کے لیے سچ بولتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں سچ اس لیے بولنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سچ کا حکم دیا ہے' اور جھوٹ بولنے سے منع کیا ہے۔

جھوٹ کی تین اقسام ہیں: افعال میں جھوٹ' اقوال میں جھوٹ اور نیتوں میں جھوٹ۔ افعال میں جھوٹ کے لیے مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی ہے کہ وہ خون آلود قمیص (بِدَمٍ كَذِبٍ) لے کر آ گئے' حالانکہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اقوال

میں جھوٹ خلافِ حقیقت بات کرنے کو کہتے ہیں۔ نیتوں میں جھوٹ کی مثال کے لیے وہ حدیث ذہن میں لائیں جس میں قیامت کے روز تین لوگوں یعنی شہید' سخی اور عالم کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا جائے گا۔ ان تینوں سے باری باری پوچھا جائے گا کہ میرے لیے کیا لائے ہو؟ وہ سب اپنے اپنے کام بتائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی بات کو رد کر دیں گے اور فرمائیں گے کہ تمہارا جنگ میں شرکت کرنا' مال خرچ کرنا اور دین کی باتیں کرنا سب ریاکاری اور دکھلاوے کے لیے تھا۔ وہ سب تم نے اپنے لیے کیا اور تمہارے پیش نظر میری رضا نہیں تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں کی بنا پر ان تینوں کو جہنم میں پھینک دیں گے۔

جھوٹ پریشانی اور سچ اطمینان کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ ، فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَإِنَّ الْكَذِبَ رِيبَةٌ)) (سنن الترمذی و مسند احمد)

''شک والی چیز کو چھوڑ کر شبہ کے بغیر والی چیزوں کو اختیار کیا کرو' سچائی میں اطمینان ہے اور جھوٹ میں شک ہے۔''

جھوٹ بولنے سے انسان باطنی طور پر کھوکھلا ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ جھوٹ سے انسان اپنے کردار کی مضبوطی کھو دیتا ہے۔

بعض لوگ مذاق میں جھوٹ بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذاق میں جھوٹ بولنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ احادیث مبارکہ میں مذاق میں بھی جھوٹ بولنے سے منع کیا گیا ہے۔ مزاح کی حس قابلِ تعریف ہے' لیکن اس میں جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں۔ بعض لوگ مسکراہٹ کی آڑ میں جھوٹ بولتے ہیں کہ مسکراہٹ ان کے جھوٹ پر پردہ ڈال دے گی' لیکن اللہ تعالیٰ تو عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ مزاح میں جھوٹ بولنے کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ملاحظہ ہو۔ بہز بن حکیم بواسطہ اپنے والد کے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزاح کے طور پر جھوٹ بولنے والے شخص پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

((وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَهُ وَيْلٌ لَهُ)) (سنن الترمذی و سنن ابی داؤد)

''ہلاکت ہے ایسے شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے۔ ہلاکت ہے اُس کے لیے' ہلاکت ہے اُس کے لیے!''

جھوٹ کے حوالے سے یہ یاد رکھیے کہ سب سے بڑا جھوٹ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے کہ کوئی شے حرام ہو تو اس کو حلال قرار دیا جائے اور حلال کو اپنی طرف سے حرام ٹھہرایا جائے۔ اسی طرح اپنی طرف سے حدیث گھڑ لینا اور اسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا واضح جھوٹ ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (متفق علیہ) ''جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ تیار کر لے''۔ ہمارے ہاں حدیث بیان کرنے میں کم احتیاط کی جاتی ہے' حالانکہ حدیثِ نبویؐ بیان کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر ہی محدثین کرامؒ نے بڑی محنت سے اصولِ حدیث وضع کیے تاکہ لوگ اس وعید سے محفوظ رہ سکیں۔

زندگی کے چند ایک امور ایسے ہیں جن میں جھوٹ بولنے کی معمولی گنجائش موجود ہے۔ ایسے امور جہاں جھوٹ بولنے کی چھوٹ ہے وہاں ہم بڑی بہادری سے سچ بولتے ہیں۔ اگر جھوٹ بولنے سے فریقین میں صلح ہو رہی ہو تو وہاں جھوٹ کا سہارا لیا جا سکتا ہے' لیکن اس مقام پر عموماً سچ کو اختیار کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں میں مصالحت نہ ہو سکے۔

جھوٹ منافق کی علامت ہے۔ سورۃ المنافقون کے آغاز میں منافقین کے جھوٹ کا ذکر ہے۔ عملی نفاق کے حوالے سے حدیث میں جو علامات بیان ہوئی ہیں ان میں سے بھی ایک جھوٹ بولنا ہے۔ اس بری خصلت سے نجات حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے کہ اس کو پورے عزم سے ترک کیا جائے۔ جو شخص ایک دفعہ جھوٹے کے طور پر مشہور ہو جاتا ہے پھر اس کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ مشہور مثل ہے: مَنْ عَرَفَ بِالْكَذِبِ لَمْ يَجِدْ صِدْقَه یعنی جو شخص جھوٹ بولنے میں مشہور ہو جاتا ہے تو جب وہ سچ بھی کہتا ہے تو کوئی اس کے سچ کی تصدیق نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ گویائی سچی بات کو چھپانے کے لیے نہیں دی ہے۔ اگر ہم جھوٹ بولیں گے تو روز قیامت ہماری زبانیں ہمارے خلاف گواہی دیں گی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ (قٓ) ''کوئی لفظ انسان کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر نگران موجود نہ ہو''۔ اہلِ سیاست کو چاہیے کہ وہ عوام سے جھوٹے وعدے نہ کریں۔ ملی اور قومی معاملات جن سے عوام کا براہِ راست تعلق ہے' وہ ان سے نہ چھپائیں۔ سیاستدان شاید سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے سیاست میں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ ان کے لیے ایسا استثناء ہرگز نہیں۔ انہیں سچ کو زیادہ اختیار کرنا چاہیے' کیونکہ انہوں نے

ملک وملت کے معاملات سنبھالنے ہوتے ہیں۔

سچ انبیاء کرام علیہم السلام کا وصف ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم) ''بیشک وہ سچے نبی تھے''۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾(مریم:٥٤) ''بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے''۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ''صدیق'' کے لقب سے سرفراز ہوئے۔صدیقیت ایک اعلیٰ مرتبہ ہے جو ہمیشہ سچ بولنے اور سچ کا ساتھ دینے کی صورت میں نصیب ہوتا ہے۔ہمیں سچ بولنے میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنی چاہیے اور کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔مختلف ممالک کو بھی ایک دوسرے سے سچائی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔سچ سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور جھوٹ سے تعلقات ٹوٹتے ہیں۔بہتر حکمت عملی اختیار کرنے کے لیے سچ پر مبنی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ایسے لوگوں کو ذمہ داریاں سونپنی چاہیے جو جھوٹ سے کنارہ کش رہتے ہوں۔ میڈیا سے وابستہ افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے سامنے سچ لائیں اور جھوٹ سے قطعاً گریز کریں۔سنی ہوئی بات بغیر تحقیق کے آگے بیان کرنا جھوٹ شمار کیا گیا ہے۔اسلام میں تحقیق کے لیے کی جانے والی کوشش کو حسن نظر سے دیکھا گیا ہے۔صحافت' وکالت اور عدالت سے وابستہ لوگوں پر بھاری فریضہ عائد ہوتا ہے کہ سچ کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں تاکہ معاشرے میں امن وسکون کو فروغ حاصل ہو۔علماء کرام کو بھی چاہیے کہ اگر دینی امور میں کسی دوسرے کی رائے بہتر ہو تو اس کو اختیار کریں اس میں اپنے مسلک پر ہٹ دھرمی کے ساتھ ڈٹے رہنا پسندیدہ عمل نہیں ہے۔لوگ باہم رشتے کرتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔اسی لیے رشتے قائم ہونے کے بعد بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں' کیونکہ ان میں جھوٹ بولا گیا ہوتا ہے۔اپنے بچوں کو سچ کی تاکید کرنی چاہیے اور اس کے لیے ان کے سامنے سچائی کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہیے۔اگر ہم خود سچ بولیں تو وہ بھی سچ بولنے کی کوشش کریں گے۔

اسلام ہی سچ ہے اور اسلام کے علاوہ تمام موجودہ ادیان باطل ہیں۔اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) الصادق والمصدوق ہیں' لہٰذا سچائی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی چاہیے۔ الغرض سچ وہی ہے جسے آپؐ نے سچ کہا اور جھوٹ وہی ہے جسے آپؐ نے جھوٹ کہا۔سچ' نجات اور امن کا باعث ہے اور جھوٹ' تباہی وبربادی لاتا ہے۔

❁❁❁

دہشت گردی کی روک تھام میں عوام کا کردار

پروفیسر محمد احمد خان ☆

میں اصل مضمون کی طرف آنے سے پہلے قارئین کو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے شب و روز میں لے جاؤں گا۔ ۱۹۶۲ء میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج نواب شاہ میں بحیثیت لیکچرار ملازمت کر لی تھی۔ جب جنگ کا آغاز ہوا تو رات کو بلیک آؤٹ ہونے لگا اور لوگوں نے خندقیں کھودنا شروع کر دیں۔ نواب شاہ میں جو پاکستان ایئر فورس کی بیس تھی وہ نان آپریشنل بیس تھی' مگر جیسے ہی جنگ شروع ہوئی وہ متحرک ہوگئی اور سب متعلقہ لوگوں نے اپنی ڈیوٹیاں سنبھال کر کام شروع کر دیا۔ اسی طرح پاکستانی فوج کی ایک بٹالین نے شہر سے باہر اپنا کیمپ لگا دیا۔ جنگ شروع ہونے کے تیسرے دن رات میں دشمن کے دو جہاز نمودار ہوئے' کیونکہ اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی فائرنگ سے یہ یقین ہو گیا کہ یہ ہندوستان کے ہی جہاز ہیں۔ تین دن تک یہ جہاز آتے رہے اور تیسرے دن انھوں نے ایک بم گرایا جو کسی آبادی میں تو نہیں گرا لیکن ایک تالاب میں گرا جس سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا' صرف آس پاس کی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹے۔ میں بارہویں جماعت کے طلبہ کی کلاس لیتا تھا۔ جب میں نے تالاب کے قریب محلّہ کے لڑکوں سے معلومات لیں تو کئی طالب علموں نے بتایا کہ رات جب بم گرا ہے اس سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے تین مختلف سمت سے خاصی تیز ٹارچ کی لائٹ آسمان کی طرف چھتوں پر سے ڈالی جا رہی تھی۔

یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی' اس لیے میں نے کسی کو بتائے بغیر پرنسپل سے مشورہ کیا اور اجازت چاہی کہ میں ہوائی اور زمینی فوج کے افسران سے مل کر صورتِ حال سے آگاہ کروں۔ میرے ایک کزن پی اے ایف ہیڈ کوارٹر پشاور میں ڈائریکٹر سگنلز تھے اور دوسرے کزن آرمی انٹیلی جنس اسکول مری کے کمانڈنٹ تھے۔ ان دونوں سے رابطہ کر کے میں آرمی اور ایئر فورس کے افسران سے ملا' جنھوں نے اپنا ایک ایک انٹیلی جنس کا بندہ دیا' جو پرنسپل کے پاس

☆ برائے رابطہ: 0300-3221822, (021)35383250

آئے اور آگے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج نواب شاہ واحد کالج تھا اور دو ہائی اسکول تھے۔ ان دونوں فوجی بندوں نے کالج سے بارہویں جماعت کے طالب علم اور ہیڈ ماسٹر صاحبان سے رابطہ کر کے میٹرک کے ۵۰ طلبہ کا انتخاب کر لیا جن کا تعلق مختلف محلوں سے تھا۔ نواب شاہ اُس وقت چھوٹا شہر تھا اور ان طلبہ کی ڈیوٹی لگائی کہ اپنے محلے کے تمام مکانات کے سربراہانِ خانہ کے نام اور گلی نمبر و محلّہ لکھ کر دو دن میں دے دیں۔ ہم چار نوجوان لیکچرار بھی ان کے ساتھ مختلف محلوں میں گئے اور دن رات لگا کر دو دن میں یہ کام مکمل کر لیا گیا۔ پھر ان حضرات سے فرداً فرداً خود بھی اور بلدیاتی نمائندوں' تاجروں اور مختلف محکموں میں کام کرنے والوں کے ذریعہ بھی رابطے کیے اور سب کو یہ پیغام دیا کہ اگر محلے میں کوئی بھی غیر مانوس اور مشکوک آدمی نظر آئے تو فوراً آرمی' ایئر فورس کے نمبروں پر اور پولیس اسٹیشن میں اطلاع دیں۔ دراصل علاقے کے ہر آدمی کا اصل کچا چٹھہ تو ایس ایچ او اور پولیس اہل کاروں کو ہی پتا ہوتا ہے۔ ایس پی اور ڈی ایس پی حضرات نے بھی تعاون کیا اور ہم سب کی کوششوں کو سراہا۔ بحمداللہ دوسرے ہی دن پتہ چلا کہ ایک دن پہلے جو دو اجنبی دیکھے گئے تھے وہ اب چلے گئے ہیں۔ لیکن ایک محلے سے ایک آدمی کو پولیس نے پکڑ کر فوج کے حوالے کر دیا۔ پھر اس کے بعد کوئی اجنبی نظر نہیں آیا۔ ایس پی صاحب نے خود کالج اور اسکولوں میں جا کر ہمت افزائی کی اور یہ بھی تاکید کی کہ غافل نہیں ہونا ہے' مستقل نگرانی رکھنی ہے۔ پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر صاحبان کی بھی ڈیوٹی لگائی۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارتی جارحیت کے ارتکاب کی صورت میں ہم پر مسلط کی گئی جنگ میں افواجِ پاکستان نے ہر محاذ پر دفاعِ وطن کے تقاضے نبھاتے ہوئے دشمن کے دانت کھٹے کیے اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرتے ہوئے مکار دشمن کی افواج کو زمینی' فضائی اور بحری محاذوں پر منہ توڑ جواب دے کر قربانیوں کی نئی اور لازوال داستانیں رقم کیں' جبکہ پوری قوم سیسہ پلائی دیوار بن کر افواجِ پاکستان کے شانہ بشانہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت و پاسبانی کے تقاضے نبھاتی رہی۔ اہلِ وطن دفاعِ وطن کے اس جذبہ کو تازہ رکھنے اور نئے عزم و تدبیر کی صف بندی کے لیے ہر سال ۶ ستمبر کو یومِ دفاع کے طور پر مناتے ہیں جو حب الوطنی کا تقاضا بھی ہے۔

اس سال ۲۰۱۶ء کا یومِ دفاع اس لیے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ آج پھر مکّار دشمن ہماری آزادی اور خودمختاری و سالمیت کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمارے خلاف نئی جنگ مسلّط کرنے کی تیاریوں میں ہے اور دہشت گردی کے پیدا کردہ ہمارے اندرونی حالات کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر ہماری سالمیت پر اوچھا وار کرنے اور اپنے اکھنڈ بھارت کے عزائم پایۂ تکمیل کو

پہنچانے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے بنگلہ دیش کے دورہ کے دوران پاکستان توڑنے میں اپنے کردار کا دعویٰ کیا اور حالیہ دنوں میں وہ بلوچستان' گلگت' بلتستان اور آزاد کشمیر میں دہشت گردوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جس پر ان کے بقول ان علاقوں سے فون کالز کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند لیڈر براہمداغ بگٹی نے مودی کو اس ہرزہ سرائی پر سلام پیش کیا۔

پاک فوج دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ضرب عضب جاری رکھے ہوئے ہے۔ پاک فوج نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی سربراہی میں لڑی جانے والی جنگ میں ۶۰ ہزار انسانی جانوں بشمول پاک فوج کے چھ ہزار سپوتوں اور ۱۰۶ ارب ڈالر کی معیشت کی تباہی کی صورت میں نقصان اُٹھایا اور پھر یہ جنگ بھی پاکستان کے گلے پڑ گئی۔ بھارت نے ایک بار پھر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور دہشت گردوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے لگا۔

بھارت آج پاکستان کے ایٹمی پاور ہونے کے باعث اس کے ساتھ بارڈر پر جنگ کرنے سے قاصر ہے' وہ اپنی سازشوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ جنگ پاکستان کے اندر لے آیا ہے۔ ہم نے ۱۹۶۵ء میں بھارت کو جنگ میں عبرتناک شکست دی تھی۔ اپنی سرحدوں کے اندر آئے دشمنوں کو نیست و نابود کرنا زیادہ آسان ہے۔ وہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ قوم ۶۵ء کی طرح فوج کے شانہ بشانہ ہو جائے۔ خصوصی طور پر مذہبی حلقے اپنا کردار ادا کریں۔ ان دہشت گردوں کے لیے کسی بھی پاکستانی کے دل میں نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ان لوگوں کو مسلمان کہا جا سکتا ہے جن کے ہاتھ حرمین شریفین کی حرمت تک پہنچ چکے ہیں؟ معروضی حالات سیاست دانوں سے بھی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہونے کا تقاضا رکھتے ہیں۔

اب مودی حکومت براہِ راست بلوچستان میں دراندازی کے نئے نئے حربے استعمال کر رہی ہے۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات بلوچ زبان میں پیش کرنا شروع کر دی ہیں۔ سیٹلائٹ کے ذریعے ایف ایم ریڈیو بلوچستان بھی سنا جا سکتا ہے۔ بھارتی چینل دوردرشن کی ایک ٹیم نے جنیوا میں پاکستان کے باغی براہمداغ بگٹی کا انٹرویو کیا جو آئن لائن ائیر کیا جا چکا ہے' جس میں وہ الطاف حسین کی طرح پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کر رہا ہے۔ بلوچستان' گلگت اور آزاد کشمیر میں بھارت اب منفی پروپیگنڈا کر کے معصوم لوگوں کو بہکانا چاہتا ہے۔

سندھی زبان میں بھی ریڈیو کا ایک چینل کام کر رہا ہے' جہاں سے یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ اصل چیز تہذیب ہوتی ہے' مذہب تو ثانوی چیز ہے۔ موہنجوڈارو کے یہ کھنڈرات یہی پیغام

دے رہے ہیں کہ ہماری تہذیب پانچ ہزار سال پرانی ہے اور پانچ ہزار سال پہلے بھی دنیا کی ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ اس سرزمین پر اصل حق ہمارا ہے' اسلام کو تو ہم پر زبردستی نافذ کیا ہوا ہے۔ اب مودی حکومت براہِ راست افغانستان' اسرائیل اور امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ مل کر بے دریغ پیسہ خرچ کر کے پاکستان میں دہشت گردی پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہی۔ امریکہ کی منافقت کا بھانڈا تو ایک امریکی مصنف اور معروف تاریخ دان سیٹر ٹارپلی نے ان الفاظ میں پھوڑا ہے:

> ''پریس ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق ایک ٹاک شو میں ویسٹر نے افغان جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نے اصل میں یہ جنگ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے شروع کی تھی اور اس حوالہ سے امریکہ کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ افغان جنگ کو پاکستان میں ایکسپورٹ کیا جائے۔ ویسٹر کا مزید کہنا تھا کہ امریکہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا' کیونکہ پاکستان میں خودکش حملوں کی لہر سے ملک میں بہت تباہی آئی' ڈرون حملے بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ ویسٹر نے کہا ہر منگل کو وہائٹ ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں صدر اوباما کو لسٹ پیش کی جاتی ہے اور سی آئی اے کی ہٹ لسٹ پر شخصیات کو قتل کرنے کے لیے اوباما اجازت دیتے ہیں۔ امریکی مصنف نے اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ڈرون حملوں سے بچوں' عورتوں اور بے گناہ لوگوں کی ہلاکت کا بڑا المیہ ہے۔''

مگر حکومتی سطح پر اس کا نہ تو سخت جواب دیا گیا نہ کوئی ایکشن لیا گیا۔ ہمارا میڈیا بھی بے حسی کا روایتی مظاہرہ کر رہا ہے۔ کیا ہم نے کبھی ایسی سازشوں کا تدارک کرنے کی کوشش کی ہے؟ مجھے اور مجھ جیسے بہت سے پاکستانیوں کو تو لگتا ہے کہ ہمارا میڈیا اور حکمران دانستہ یا نادانستہ دشمن کے ایجنڈے پر کاربند ہیں اور ہم بحیثیتِ قوم خواب غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ اجتماعی بے حسی کیا ہوسکتی ہے؟

بھارت پاکستان کا براہِ راست مقابلہ نہیں کرسکتا' وہ چھپ کر وار کرے گا۔ دشمن کا حملہ کئی روپ اختیار کرسکتا ہے۔ اس میں دہشت گردی بھی شامل ہے' اس لیے قوم کے ایک فرد کو چپے چپے پر دہشت گردی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہم نے بحیثیت قوم اور ہماری جملہ سیاسی جماعتوں اور تنظیموں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دہشت گردی سے نمٹنے کا کام صرف افواج پاکستان' نیم فوجی تنظیموں اور پولیس کی ذمہ داری ہے۔ نہیں میرے دوستو' ہرگز نہیں! یہ ہم میں سے ہر

ایک کا فرداً فرداً فرض بنتا ہے کہ ہر آدمی دامے درمے سخنے اس ملک خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بقا کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ ہم سب کو سیاسی اختلاف سے بالاتر ہو کر محلے میں گلی گلی میں وہی ترتیب بنانی چاہیے جیسی آپ بلدیاتی‘ صوبائی یا قومی اسمبلی کے الیکشن کے موقع پر الیکشن کمیشن سے لسٹ حاصل کر کے گھر گھر جا کر تفصیل جمع کرتے ہیں۔ اصل مقصد تو اس ساری محنت کا یہی معلوم کرنا ہے کہ کوئی اجنبی آدمی تو ہماری گلی محلّہ میں نہیں ہے۔ میں نے شروع میں ۶۵ء کی جنگ کا ذکر کیا تھا۔ جب تو ذرائع بے حد محدود تھے‘ سائیکل کا شمار بھی عیاشی میں ہوتا تھا۔ آج تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے‘ بے پناہ موٹر سائیکل‘ کاریں‘ جیپیں‘ موبائل فون‘ فیس بک‘ واٹس اپ وغیرہ پر اطلاع دینے کے ذرائع ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں بھی ٹرانسپورٹ مہیا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ایس ایچ او کا تقرر سیاسی نہ ہو اور اسے اتنا عرصہ تک ایک پولیس اسٹیشن میں رہنے نہ دیا جائے جس عرصہ میں اپنی ٹیم کے ساتھ علاقہ کے ہر آدمی سے باخبر ہو۔ مساجد بھی معلومات کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ پھر ماشاء اللہ جو نوجوان تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں اور ہفتہ میں ایک بار ایک ایک مکان کا گشت کرتے ہیں وہ بھی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ رینجرز‘ آرمی‘ نیوی‘ ایئر فورس اور ٹریفک پولیس کے لوگ رہنمائی بھی کر سکتے ہیں اور انتہائی کم وقت میں نوجوانوں کی ٹیمیں بنا کر انتہائی منظّم طریقہ سے عمل درآمد بھی کرا سکتے ہیں۔ جس دین میں پڑوسی کے بے پناہ حقوق ہوں وہاں بدقسمتی سے برابر والے مکان کے باسی کا پتہ ہی نہ ہو۔ اب تو ایمرجنسی فون نمبر بھی اتنی تعداد میں ہیں کہ دس منٹ میں گاڑی پہنچ جائے گی۔

مسلم لیگ‘ پیپلز پارٹی‘ جماعتِ اسلامی‘ تحریکِ انصاف‘ متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی غرض سب کے پاس نوجوانوں کی ایک فوج ظفر موج ہے۔ ضرورت ان کی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں استعمال کرنے کی ہے اور انہیں یہ احساس دِلانا ہے کہ تم تو بہترین امت کے فرد ہو۔ اللہ ربّ العزت کے حضور توبہ کر کے رحمٰن کی بندگی میں تو آؤ‘ پھر کھلی آنکھوں سے تم وہ مدد دیکھو گے اور وہ راستے کھلیں گے جس کا تمہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ شیطان کو تو یہ کبھی گوارا نہیں ہوگا۔ وہ تو یہی پٹی پڑھائے گا کہ مزے سے کھیل کود میں مگن تھے‘ یہ کس مشقت میں تم نے اپنے آپ کو ڈال لیا۔ میری عاجزانہ گزارش گھر کے بزرگ ذمہ دار افراد سے بھی ہے کہ کچھ وقت نکالیں اور جنگی بنیادوں پر اس کام میں لگ جائیں۔ بدقسمتی سے آج جہاں اور عذاب ہیں وہاں ایک ’’مصروفیت‘‘ کا عذاب بھی ہے۔ جس سے بات کرو وہ یہ مضحکہ خیز جملہ کہتا نظر آئے گا کہ ہمیں تو مرنے کی بھی فرصت نہیں ہے‘ حالانکہ ہزاروں کے مجمع سے جب ملک

الموت اٹھائے گا تو صرف انھی کو نظر آئے گا جس کا وقت پورا ہونے کا وہ اعلان کرے گا کہ پوری دنیا میں ایک گندم کا دانہ بھی اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس لیے بلاول بھٹو ہوں‘ نواز شریف ہوں‘ شہباز شریف ہوں‘ سراج الحق صاحب ہوں‘ شاہی سید ہوں‘ فاروق ستار ہوں‘ سندھ عوامی پارٹی کے لیڈران ہوں‘ کے پی کے اور بلوچستان کے اہل اقتدار ہوں‘ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ہوں‘ بری‘ بحری اور فضائی فوج کے سربراہان ہوں‘ ڈی جی رینجرز ہوں‘ آئی ایس آئی‘ ایم آئی یا عدلیہ کے معزز جج صاحبان ہوں‘ سول سوسائٹی کے لوگ ہوں‘ بشمول معزّز وکلاء صاحبان‘ آیئے آگے بڑھیے اور اللہ کی اس نعمت کی قدر کیجیے تاکہ حشر کے میدان میں ایسے سخت دن میں جہاں ماں اپنی مامتا کو بھول جائے گی ربِّ ذوالجلال کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ باتیں بہت ہو چکیں‘ دھرنے بھی ہو چکے‘ جلسے بھی خوب خوب ہوئے‘ الزامات بھی لگ گئے‘ غیبتیں بھی کر لیں۔ روزانہ کی دیہاڑی والوں کے گھر چولہا نہ جل سکا اور بچے بھوکے سو گئے‘ مریض ہسپتال نہ جا سکے اور راستے میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے نوجوانانِ مسلم سے خطاب کرتے ہوئے یہی تو کہا تھا ؎

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار‘ وہ کردار‘ تو ثابت‘ وہ سیارا

دوستو! ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ دہشت گردی ان شاء اللہ جڑ سے اُکھاڑ پھینکیں گے۔ اللہ کے احکامات تو وجہِ خلقِ کائنات ﷺ کے طریقہ پر مان کر زندگی گزاریں تو اللہ کی قدرت تمہارے ساتھ ہوگی۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ سب چلتے پھرتے قرآن تھے۔ سادگی اور جفاکشی کے پیکر تھے۔ ان کو وہ فراستِ ایمانی عطا کی گئی تھی جس کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر مومن کو مل سکتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی فراست سے ہوشیار رہنا‘ اس لیے کہ وہ اللہ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر فتح کیا اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ کی قلمرو میں شامل کیا‘ اس وقت اس بات کے سارے قرائن موجود تھے کہ مصر مسلمانوں کے قبضہ میں رہے گا۔ قبطی سلطنت دم توڑ چکی تھی اور ملک میں مقابلہ کی کوئی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے مرکز مدینہ طیبہ سے اور جزیرۃ العرب سے اس کا جو جغرافیائی قرب تھا‘ وہ بھی اس بات کی ضمانت تھا کہ مصر کی پوری طور پر نگرانی کی جا سکے گی اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کا

مستقبل محفوظ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن ممالک کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتح کیا وہ کُلّی طور پر اسلام کی دولت سے محروم نہیں ہوئے۔ اس لیے اس بات کو باور کرنے اور اس بارے میں اطمینان حاصل کرنے کے سارے آثار و قرائن موجود تھے کہ مصر میں کسی بڑے انقلاب کا خطرہ نہیں ہے۔ مصر فتح ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلمانوں کے قدم جم چکے تھے۔ مساجد تعمیر ہو رہی تھیں اور مصر کی بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا ہرقل دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ہے اور اس سلطنتِ بازنطینہ کے مقبوضات (Byzantine Empire) جن میں شام اور فلسطین کا علاقہ بھی تھا' اسلام کے زیرِ سایہ آ چکے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے صحبت نبوی کی برکت سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جو فراستِ ایمانی عطا کی تھی اور خداداد بصیرت سے نوازا تھا' آپؓ نے اسی فراست ایمانی کی وجہ سے ایک جملہ کہا جس کو تاریخ نے انہی کے الفاظ میں محفوظ کر لیا ہے اور یہ جملہ قیامت تک آنے والے ہر مؤمن فاتح اور جملہ اہلِ ایمان کے لیے مشعل راہ ہے: **انتم فی رباط دائم لکثرۃ الأعداء حولکم ولتشوف القلوب الیکم** یعنی ''تم ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا کہ تم محاذ جنگ پر ہو اور اسلامی سرحد کے محافظ ہو' اس لیے کہ دشمن کی نگاہیں تم پر لگی ہوئی ہیں اور ان کے دل ابھی تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوئے۔''

بہت سے قرآنی الفاظ ایسے ہیں جن کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ رباط کا ترجمہ بھی کسی مفرد لفظ سے کر دینا مشکل ہے۔ ناکہ بندی' سرحد کی حفاظت' کسی کام میں مسلسل منہمک رہنا' یہ سب رباط کے مفہوم میں آتا ہے۔ مسجد میں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنے کے لیے بھی رباط کا لفظ آتا ہے۔ رباط کے لفظ میں عسکری و جسمانی طور پر اور اس کے ساتھ معنوی' ذہنی اور فکری طور پر بھی ہمیشہ چوکنا رہنے کا مفہوم آ جاتا ہے۔ آپؓ نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ قدیم آبادی کسی وقت بھی جب اہرامِ مصر کو دیکھے گی جو فراعنہ نے بنائے تھے اور جب وہ اس ملک کی سرسبزی و شادابی دیکھے گی تو اس کو یاد آئے گا کہ کبھی یہاں ہماری سلطنت تھی' تو تم اس سے غافل نہ رہنا۔ سارے برّاعظم افریقہ میں ابھی مصر ہی ایسا ملک ہے جو اسلام کے زیرِ نگین آیا ہے۔ اس لیے اگر تم ہمیشہ چوکنا نہیں رہو گے تو اس ملک میں اسلام کا محفوظ رہنا مشکوک ہے۔ مسلمانوں کو آزاد مسلم ممالک میں بھی ہمیشہ اس وصیت پر عمل کرنا چاہیے اور اپنے اندر رابطانہ کیفیت پیدا کرنی اور قائم رکھنی چاہیے کہ وہ ان سب چیزوں سے بچیں جو غفلت پیدا کرنے والی ہیں' جو دشمن کو موقع دینے والی ہیں۔

فتنے صرف خارجی نہیں ہوتے داخلی بھی ہوتے ہیں اور داخلی فتنے بعض اوقات خارجی

فتنوں سے زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج رکھتے ہیں۔ اسپین جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا وہ کسی خارجی حملہ سے نہیں نکلا بلکہ مسلمان اندر سے خود سمٹنے اور بکھرنے لگے تھے۔ اندرونی کمزوریاں جب کسی ملک میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت سارے چھوٹے بڑے مسلم ممالک کو حرزِ جان بنانی چاہیے کہ ''**انتم فی رباط دائم**'' تمہاری پہرہ داری اور بیداری کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے' تم کبھی اس سے فارغ البال نہ ہونا۔ شاعر نے سچ کہا ہے ؎

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُس کو چُھٹّی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا!

حقیقت میں اُمتِ اسلامیہ کے لیے چھٹی ہے ہی نہیں۔ اُمتِ اسلامیہ کے سپرد جو کام کیا گیا ہے اور اس کی جو مشکلات ہیں اس میں چھٹی کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ چھٹی کا تو ایک وقت ہوتا ہے اور ایک ذہن ہوتا ہے۔ چھٹی والی ذہنیت فراغت سے زیادہ خطرناک ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہاں جہاں اسلام کا زوال ہوا ہے وہاں یہ ذہنیت پیدا ہوئی ہے' یعنی راحت پسندی' آرام طلبی اور محنت سے فائدہ اُٹھانے کا مزاج۔ یعنی محنت ہو چکی' اب محنت سے فائدہ اُٹھانے کا وقت آیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں آخر وقت تک یہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت تیار رہتے تھے کہ جب ان کو محاذ پر بلایا جائے گا چلے جائیں گے۔ یہ سوچ کہ پوری عمر محنت کرنے کے لیے نہیں ہوتی' اب آرام کا وقت آیا ہے' یہ اُمتِ اسلامیہ اور بالخصوص کسی ایسے اسلامی ملک کے لیے جو بیرونی اور اندرونی خطرات سے ہر وقت دوچار ہو سم قاتل ہے' اس ملک کے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔

ہم بھی پاکستان میں ''**أنتم فی رباط دائم**'' کو دستور العمل بنالیں۔ ہم ایک ایسے محاذ پر کھڑے ہیں جہاں ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ پلک جھپکتے ہی میدانِ جنگ کا نقشہ بدل جائے گا' اس لیے پلک جھپکنے اور سونے کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک بھرپور مہم بغیر کوئی وقت ضائع کیے بغیر چلانے کی ضرورت ہے' جس میں ریڈیو' پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور تمام ذمہ دار محبّ الوطن پاکستانی شامل ہوں۔ دوستو یہ ملک ہے تو ہم ہیں اور یہ ساری مستیاں ہیں۔ آزادی بڑی نعمت ہے' اس کی قدر کرو۔ کشمیریوں سے پوچھو آزادی کیا ہوتی ہے۔ جلسوں میں اور دھرنوں میں لوگوں کو جمع کرنا اور پولیس اور رینجرز کا اپنا اصلی کام چھوڑ کر ان کی سیکیورٹی میں لگنا نہ صرف وقت بلکہ رقم کا بھی نقصان ہے۔ اور شہروں' گاؤں اور محلوں کو خالی چھوڑنا دہشت

گردوں کی سہولت کاری نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟ اس پر طرّہ یہ کہ روزانہ دیہاڑی دار مزدور کے گھر میں چولہا نہ جلے، بچے بھوکے سو جائیں، بیمار ہو تو ہسپتال نہ جا پائیں، اسکول میں امتحان ہو تو اسکول نہ پہنچ پائیں اور پورا سال ضائع ہو جائے، کوئی بیوہ بیچاری زیور بیچ کر قسطوں پر رکشہ خرید کر کرائے پر چلوا کر اپنا پیٹ بھرنا چاہے تو اول تو پیٹرول پمپ کی بندش کی وجہ سے وہ سڑک پر نہ آ سکے اور اگر آ جائے تو جلا دیا جائے، آدمی دفتر نہ جا پائے، خدا خدا کر کے مقدمہ کی تاریخ آئے اور اپنی عمر بھر کی جمع پونجی مقدمہ کے اخراجات پورے کرنے میں لگا دی جائے مگر عدالت تک جانے کا رستہ ہی بند ہو اور اگر کھلا بھی ہو تو جج صاحب یا وکیل صاحب تشریف نہ لائیں اور پھر تاریخ پڑ جائے اور اس تمام کارروائی کو ہمارے ممبران صوبائی و قومی اسمبلی اور ممبران سینٹ اور سیاست دان اپنا ''جمہوری حق'' قرار دیں۔ چاہے خود جس بات کی تنخواہ پا رہے ہیں اور بے پناہ فوائد اُٹھا رہے ہیں اس اسمبلی میں جب جی چاہا چلے جائیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آفرین ہے ہمارے اسپیکر صاحبان اور چیئرمین سینٹ کو کہ پھر کوئی ایکشن بھی نہیں، بلکہ اُلٹی خوشامد کی جا رہی ہے۔ آئے تھے قانون سازی کے لیے اور اکثریت قانون سے ہی نابلد۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ''پاکستان میں ہر ماہر کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے علاوہ ہر چیز کا ماہر ہو''۔

ترقی کی راہوں میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا جس کو منزل کہا جا سکے اور نہ کوئی ایسا آج آتا ہے جس کو فکرِ فردا سے آزاد کیا جا سکے۔ افراد، ادارے یا قومیں بہتری کی خواہش سب کو سعی پیہم پر آمادہ رکھتی ہے اور وہ خوش آئند مستقبل کے لیے ہمیشہ تگ و دو کرتے ہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ جو امروز پر مطمئن ہو گیا وہ ترقی کی صف سے نکل گیا۔ اسے جلد زمانے نے بھلا دیا۔ اگر روشن تر مستقبل درکار ہے تو قدرت کے اس اٹل قانون کی اطاعت کرنی ہوگی۔''

اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں دعا بھی کریں اور بھروسہ کرتے ہوئے ہمت و حوصلہ کے ساتھ جنگی بنیادوں پر اپنے آپ کو منظّم کر لیں۔ ان شاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی اور اللہ تعالیٰ برکت بھی نازل فرمائے گا اور دعاؤں کو شرفِ قبولیت بھی بخشے گا۔

اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

(نوٹ: آخری پیرگراف میں کچھ اقتباسات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (علی میاں) کے کراچی کے بیان سے لیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولاناؒ کو دارین کی سعادتوں سے نوازے۔ آمین!)

Dec. 2016
Vol. 65

Regd. CPL No. 115
No.12

Monthly Meesaq Lahore

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّوویؒ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نوویؒ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے خطاباتِ جمعہ

❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ معیاری طباعت
❁ 852 صفحات ❁ دو حصوں پر مشتمل ضخیم کتاب
❁ قیمت 600 روپے

خود پڑھیے ...... احباب کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501
email: maktaba@tanzeem.org website: www.tanzeem.org